ھمارے ولی

شیخ احمد مصطفیٰ قاسم

بار اوّل ـــــــ اپریل ۱۹۸۰ء
ناشر ـــــــ رشید سالک
تعداد ـــــــ گیارہ سو
مطبع ـــــــ منظور پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت: بارہ روپے

مندرجات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

"ہمارے ولی" ـــــ ان تقدس مآب، برگزیدہ، سربلند اور خدا دوست ہستیوں کا وہ تذکرہ ہے جسے ان گنت مستند سوانح، وقائع اور تواریخ کے گہرے مطالعے کے بعد زیورِ تدوین و تالیف سے آراستہ و پیراستہ کرنے کی مساعی کا شرف حاصل ہے۔
اس نایاب کتاب میں چند اولیائے کرام کا تفصیلی تذکرہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ درجنوں ایسے مشہور و معروف ولیوں کے واقعات بھی شامل ہیں جنہوں نے چمنِ اسلام کی آبیاری کے لیے اپنے روز و شب ایک کر دیے ہیں۔

یہ وہ اولیائے کرام ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے دینی، عمرانی، اخلاقی اور روحانی کردار میں اپنے حسنِ عمل سے اصلاح کرنے کے علاوہ دوسرے لاکھوں انسانوں کی تاریک آنکھوں کو بصیرت و بصارت کی روشنی دے کر انہیں دائرہ اسلام میں شریک کر لینے کا وہ شاندار، عدیم النظیر اور افادیت سے لبریز کارنامہ انجام دیا ہے جس کا معاوضہ صرف خالقِ عالم کی جانب سے ہی مقرر اور معین کیا جا سکتا ہے۔

ان بزرگانِ دین کی سب سے عظیم کارکردگی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی ہستی کو تسلیم و رضا کا خوگر اور صبر و استقامت کا پیکر بنا کر دینِ اسلام کی ترویج و ارتقا میں اس وقت سرگرمی اور جوش و خروش سے حصہ لیا جب اس کی عالمگیر برادری کے مقدس اور سربلند پرچم میں وہ تین نمایاں رنگ جو اخوت، مساوات اور حریت کا مظہر تھے، نت نئی گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کی وجہ سے ماند پڑنے لگے تھے۔

جذبۂ ایمان وایقان سے سرشار ہونے والی اِن پاک اور عظیم ہستیوں میں حق بات کہنے کا سلیقہ تھا۔ انہیں حضور سرورِ کائنات رسولِ اکرم کی پیغام رسانی کا طریقہ معلوم تھا اور اِن اولیا اللہ (خدا کے دوستوں) میں سب سے ممتاز و نمایاں کرامت یہ تھی کہ وہ صاحبِ علم وعمل تھے انہیں طہارت وتقویٰ کی سعادت اور مطیع الامری کی دولت حاصل تھی ۔ احکام شرعیہ کی بجا آوری اُن کی زندگی کا نصب العین اور سب سے بڑا حسنِ کردار یہ تھا کہ اُن کے نزدیک شریعت کے حدود کو عبور کرنا کفر کی سرحدوں میں داخل ہونے کے مترادف تھا اپنے کردار میں اِن خوبیوں اور صفات کی وجہ سے اُن کے پیکر میں ایسی جاذبیت، اتنی دلکشی اور اس قدر مقناطیسی کشش پیدا ہوگئی تھی کہ ہزاروں انسان، کیا مسلم کیا غیر مسلم دُور دراز کے فاصلے طے کرتے ہوئے کبھی فرد فرد، کبھی جوق در جوق آپ سے آپ ان کی بارگاہوں میں کھنچے چلے آتے اور فیضِ روحانی حاصل کر کے نہال ہو جاتے۔ اللہ کے اِن دوستوں کے قول وفعل میں اتنی ہم آہنگی تھی کہ اُن کے لبوں سے نکلی ہوئی آوازیں نوشتہ تقدیر بن جاتیں ۔ بلاشبہ اُن کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اُن کی جبینوں پر نورِ خدا چمکتا تھا اور ظلِّ الٰہی اُن کے سروں پر غیر مرئی چھتریوں کی طرح سایہ فگن تھا ۔

"ہمارے ولی"۔ آپ کے ہاتھوں میں پہنچانے کا مقصد ہم آپ پر واضح کر دیں کہ اللہ کی رحمت بخشش جود وعطا کے سب ہی دروازے ایسے تمام انسانوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں جو اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں، اُس سے خوفزدہ رہتے ہوتے کارہائے ثواب میں مصروف ومنہمک ہو جاتے ہیں ۔ اِس کتاب کی سطر سطر، ورق ورق اِس حقیقت کی شہادت ہے کہ جو اللہ کو یاد رکھتا ہے اُسے اللہ کبھی بھی فراموش نہیں کرتا اور جو اللہ کا بندہ بن جاتا ہے اللہ اُس کا ہو جاتا ہے ——— اور انجام کار اُس کی ہستی مرکزِ کارکشائی ——— محورِ کارسازی ——— اور منبعِ کار آفرینی بن کر مرجع خلائق بن جاتی ہے ۔ ⁂

طالبِ دُعا
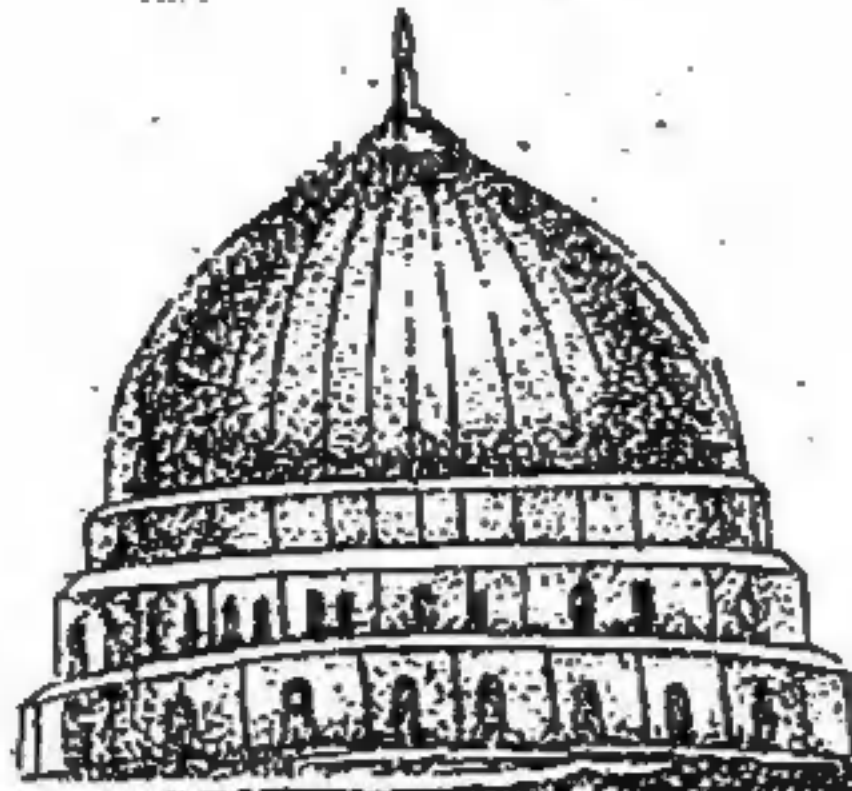
احمد مصطفےٰ صدیقی راہی

پیدائش ۲۱ ہجری مدینہ منورہ میں بتائی جاتی ہے آپ نے بصرہ میں پرورش پائی۔ اسی مناسبت سے بصری کہلائے۔ آپ کے والد محترم کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعضوں نے یسا لکھا ہے لیکن موسیٰ بن راعی بن خواجہ اویس قرنی بہت مشہور ہے۔

یہ بات تمام تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق لکھی ہے کہ جب خواجہ صاحب پیدا ہوئے تو آپ کے والد محترم جناب موسیٰ بن راعی انہیں دعائے خیر و برکت کے لئے حضرت عمر فاروق رضؓ کی خدمت میں اٹھا لائے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے جب آپ کو دیکھا تو فرمایا کتنی پیاری صورت ہے' ماشاءاللہ بڑا ہی خوبرو اور حسین و جمیل بچّہ ہے۔ اس کا نام حسن رکھو چنانچہ جناب آپ نے اسی نام سے شہرت دوام پائی۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں جناب حسن کی کنیت ابوسعید بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ جواہر فروشی کے سبب آپ حسن لولوئی کے نام سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ لیکن واضح رہے خواجہ حسن بصری کے علاوہ اس نام سے ایک بزرگ سنہ ۲۰۴ھ میں جناب امام اعظم

ابو حنیفہؒ کے شاگرد بھی ہوتے ہیں جو اپنے وقت کے بڑے ہی باکمال امام تھے ان کے نام کی وجہ تسمیہ بھی وہی ہے جو حضرت خواجہ کے نام کی ہے۔

(حسن بن زیاد لولوئی متوفی ۲۰۴ھ)

شرف تلمذ یوں تو جناب خواجہ نے بڑے بڑے صحابیوں کو دیکھا ہے اور ان کی صحبت سے فیض اٹھایا ہے لیکن علوم ظاہری و باطنی آپ نے بالخصوص حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی سے حاصل کیے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ آپ جناب امام حسنؓ کے مرید و شاگرد تھے۔ ممکن ہے آپ دونوں ہی کے مرید و شاگرد ہوں جن لوگوں نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ آپ نے جناب علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور آپ کو ان سے علوم باطنی تلقین ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جناب علیؓ کی شہادت کے وقت آپ صرف انیس ۱۹ برس کے تھے۔

مگر یہ دلیل درست نہیں دیکھا گیا ہے کہ اکثر اولیائے کرام اور آئمہ دین نے اس سے بھی کم عمر میں جملہ علوم دین میں تکمیل پائی ہے لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ ایک انیس ۱۹ برس کا نوجوان تلقین علم و آداب میں بارگاہ مرتضوی سے ضرور بہرہ ور ہوا ہے۔

صاحب تحفۃ الابرار نے لکھا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ چودہ برس کی عمر تک مدینہ منورہ میں رہے اسی طرح جناب علی کرم اللہ وجہہ بھی چودہ برس تک مدینہ منورہ میں ہی مقیم رہے حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت پر جب لوگوں نے آپ سے خلافت قبول کرنے پر بہت ہی اصرار کیا اور آپ خلیفہ بنائے گئے اس وقت بھی آپ مدینہ ہی میں رہتے تھے بلکہ خلیفہ ہو جانے کے بعد بھی چند مہینوں تک یہیں رہے پس یہ بیان اس بات کے لئے کافی ہے کہ آپ حضرت علیؓ کے مرید اور شاگرد تھے۔

علاوہ ازیں ایک قوی دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ کے دوران قیام بصرہ میں آپ نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے تبرکاً طہارت سکھا دیجئے چنانچہ جناب علی کرم اللہ وجہہ نے ایک طشت منگوا کے آپ کو وضو کرنا سکھایا۔ بصرہ

ہیں وہ مقام جہاں یہ واقعہ ہوا آج تک باب الطشت کے نام سے مشہور ہے۔
پس ان حالات کی روشنی میں یہ بات قطعی واضح ہے کہ خواجہ حسن بصریؒ کو جناب علی کرم اللہ وجہہ سے شرف تلمذ نہ کرنے اور بیعت کی سعادت حاصل کرنے کا ضرور موقع ملا ہے۔

اس کے علاوہ ایک شہادت یوں بھی ملتی ہے کہ بصرہ کے دورہ پر جب حضرت علیؓ بصرے کی مسجد میں گئے تو اس وقت انہوں نے تمام واعظین کرام کو وعظ و تلقین سے روک دیا تھا لیکن جب خواجہ حسنؒ بصری کو جو اس وقت وعظ و تلقین فرما رہے تھے نہیں روکا اس واقعے سے جناب خواجہ کی عظمت شان کا بھی ایک اندازہ ہوتا ہے۔

فضیلت علمی امام زہریؒ نے (ولادت ۵۱ھ ۔ وفات ۱۲۴ھ) جو اعلام تابعین سے ہیں، متعدد اصحاب رسول سے تعلیم پائی وہ فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے عالم صرف چار ہی ہیں۔ مدینہ میں المسیبؒ، شام میں مکحولؒ، کوفہ میں شعبیؒ۔ یہ علامہ شعبیؒ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اوّل اوّل جناب امام اعظم ابو حنیفہ کو حصول علم کی ترغیب دی۔ بصرے میں جناب امام المتصوفین والعارفین خواجہ حسن بصریؒ

تمام سیرت نگاروں نے یہ بات بالاتفاق لکھی ہے کہ خواجہ حسن بصریؒ اگرچہ نسلاً حبشی تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت بڑا فصیح اللسان بنایا۔ حجاج بن یوسف آپ کی وضاحت کے مقابلے میں خود کو ہیچ سمجھتا تھا۔

علامہ ذہبی نے اسلام کے دوسرے اور تیسرے دور میں جن حاملین حدیث کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تصنیفات و ملفوظات کے مستقل ترجمے لکھے اور انہیں ترتیب دیا ہے ان میں جناب خواجہ سر فہرست ہیں اس کے علاوہ ذہبی نے خواجہ کے مفصل حالات تحریر کیے ہیں۔

ڈاکٹر نکلسن نے لٹریری ہسٹری آف دی عرب میں لکھا ہے کہ اسلام کے

دورِ اول میں جن اولیائے کرام پر خوفِ الٰہی طاری رہتا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جباریت و قہاریت سے لرزہ براندام رہنا ان کی پہچان قرار پا گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گریہ وزاری کرنا اور گناہوں کے خیال سے مضطرب الحال رہنا جن اولیائے کرام کے بارے میں خاص زور دے کر بیان کیا جاتا ہے ان میں جناب خواجہ بصریؒ امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مسلک معرکہ کرب و بلا اور اس کے بعد بھی دنیا کو مقصود بالذات سمجھنے والوں نے قتل و غارتگری کا جو بازار گرم کیا جناب خواجہؒ اسے ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ یہ طریقہ ہی مؤثر ہو سکتا تھا۔ جناب خواجہؒ نے مسلمانوں کے ذہن کے دنیا سے رُخ پھیرنے کے لیے دین میں کمال زہد و اطاعت کی بنیاد رکھی۔ الفتِ دنیا کی سخت مذمّت کی اور یہاں تک نفرت کی کہ دنیا کی محبت کو ایمان کی کمزوری قرار دیا ہے۔

لیکن خواجہ حسن بصریؒ نے دنیا اور دنیا والوں کے خلاف جو مہم شروع کی تھی اور لوگوں کو دنیا کی بجائے آخرت کی فکر کرنے پر متوجہ کیا تھا اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ لوگوں کو رہبانیت کی طرف بُلاتے اور تارک الدنیا ہونے کی تعلیم دیتے تھے بلکہ اس کا مقصد فقط یہ تھا کہ مسلمانوں میں جو اقتدار کی جنگ لڑی جا رہی تھی اور استحکام سلطنت کے نام پر ہر طرف خون خرابہ ہو رہا تھا وہ رک جائے اور ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ لوگ دین کو دنیا کے لئے داؤ پر لگانے کی بجائے دنیا کو دین پر لگا دیں۔

دراصل زہد و عبادت، گوشہ تنہائی اور اللہ کے خوف سے روتے رہنے کی جو بنیاد خواجہ حسنؒ بصری نے رکھی وہ آپ کے زمانے کے سیاسی احوال کا نتیجہ ہے۔ ایک اعتراض تجرّد پسند کرنے کا جناب خواجہ پر ضرور ہو سکتا ہے مگر اس کا سبب بھی وہی احوال ہیں جو اس زمانے کے مسلمانوں کو درپیش تھے اور خواجہ کو دن رات یہی فکر تھی کہ ان کی بدحالی کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے

جا گئے غرض آپ کو یہی خیال رہتا اور یہ آپ کی طبیعت پر اتنا حاوی ہو چکا تھا کہ تمام عمر آپ کو کسی نے کبھی ہنستے نہیں دیکھا۔

مسلمان کی تعریف دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ کسی نے آپؒ سے دریافت کیا کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ اور مسلمان کسے کہتے ہیں۔
جواب میں ارشاد فرمایا "مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور" یعنی مسلمانی کتاب میں ہے اور مسلمان قبر میں ہیں۔ پھر آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ یا حضرت ہمارے دل سوئے ہوئے ہیں آپ کے ارشادات اور پند و نصائح کا ان پر اثر کیوں نہیں ہوتا ہمیں اس کے لئے کیا علاج کرنا چاہیے فرمایا اگر دل سوتے ہوئے ہی ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ انہیں جھنجوڑ کر جگایا جا سکتا تھا رونا تو یہ ہے کہ دل مر چکے ہیں اب انہیں کتنا ہی جھنجوڑو، جگانے کی کوشش کرو یہ بیدار نہیں ہو سکتے۔

جناب خواجہؒ نے مسلمانوں کو دنیا اور صرف دنیا ہی کے بن کے رہ جانے پر بڑی سختی سے روکا اور خلاف شریعت چلنے سے منع کیا آپ کی نظر قرآن حکیم اور حدیث نبوی کی تفصیل پر تھی اس لیے آخرت کی زندگی آپ کے نزدیک گویا آنکھوں دیکھی چیز تھی دنیا کی بہتات اور چاہت نے مسلمانوں کو دین سے غافل بنا دیا تھا اور وہ آخرت کی زندگی کو بھولتے جا رہے تھے آپ نے انہیں جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ انہیں چونکایا اور بتا دیا کہ تم صرف زبان ہی سے اقرار کر لینے پر مسلمان نہیں بن سکتے مسلمان اور کامل مسلمان بننے کے لیے سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ جن حقائق کا تم دل سے اقرار کرتے ہو ان پر دل کے ساتھ پورا پورا عمل بھی کرو۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جناب خواجہ کا بیان درد و کرب اور سوز و گداز سے پُر ہوتا یہی سبب تھا کہ جو بات آپ کے منہ سے نکلتی لوگوں کے دلوں میں تیر کی طرح اُترتی چلی جاتی آپ کی زبان مبارک میں غضب کا اثر تھا جو ایک مرتبہ کہہ دیتے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتا یہی سبب ہے کہ آپ کو ایک خلق خدا امام زمانہ صاحب کرامت اور مستجاب الوقت ولی تسلیم کرتی ہے۔

ایک روز آپ اپنی عبادت گاہ کے بالاخانے پر بیٹھے رو رہے تھے اور کثرت گریہ سے آنسو رخسار پر بہہ رہے تھے ایک شخص نیچے سے گزرا اس کے اوپر چند آنسو گر گئے اس نے اوپر دیکھ کر پوچھا اے شخص یہ قطرے پاک تھے کہ ناپاک۔ آپ نے فرمایا اے بھائی یہ مجھ گنہگار کے ناپاک آنسو ہیں۔ انہیں دھو ڈال۔

جائے عبرت جنازے کے ساتھ چلنا آپ کے نزدیک فرض اولی تھا۔ ایک مرتبہ کسی کے جنازے میں شریک تھے۔ جب لوگ اسے قبر میں اتار چکے اور گھر کو واپس آنے لگے تو آپ ایک جگہ بیٹھ گئے اور لوگوں سے فرمایا اے دنیا کے پرستارو مال و دولت کے متوالو دیکھ لیا تم نے آدمی کا انجام یہ جگہ دنیا کا آخری مقام اور آخرت کی پہلی منزل ہے پھر کیا نازؔ اور کیا غرور اس دنیا پر جس کا انجام بالآخر یہ ہے سن لو کہ یہ دنیا جائے عبرت ہے۔

طلب آخرت ایک مرتبہ آپ نے خادم سے فرمایا کہ افطاری کے لیے بازار سے روٹی اور مچھلی کے کباب لے آؤ خادم نے تعمیل کی۔ جب افطاری کا وقت آیا تو آپ نے خادم سے فرمایا یہ کباب اور مزے کا کھانا مجھ فقیر سے اس کا کیا تعلق؟ اس نے عرض کیا کہ آپ ہی نے تو فرمایا تھا۔ آپ نے یہ سن کر سر جھکا لیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا باری تعالیٰ میں نے دنیا کی نعمتوں پر دھیان دیا مجھ سے بھول ہوئی میرا نام کہیں درویشوں کی فہرست سے مٹا نہ دینا۔

انکسار ایک مرتبہ دریائے دجلہ کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ وہاں ایک حبشی کو دیکھا کہ ایک عورت کو پہلو میں لیے بیٹھا ہے اور اس کے قریب ہی شراب کی ایک بوتل پڑی ہے وہ خود بھی پی رہا ہے اور عورت کو بھی پلا رہا ہے آپ کے دل میں خیال گزرا کہ یہ شخص اگرچہ شراب پی رہا ہے تاہم مجھ سے ہر حال میں بہتر ہے پھر سوچا کہ بہتر کیونکر ہو سکتا ہے یہ تو شراب پی رہا ہے اتنے میں آپ نے دیکھا کہ مال و اسباب سے لدی ہوئی ایک کشتی آ رہی ہے جب وہ کشتی حبشی کے قریب آئی تو ڈوب گئی جس میں مال اسباب کے علاوہ سات آدمی بھی تھے جو غوطے کھانے لگے حبشی فوراً

دریا میں کود پڑا اور انہیں باہر نکال لایا یہ دیکھ کر آپ نے اس خیال سے توبہ کر لی اور دریائے فنا میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی طرح خود بھی حبشی کی اس جرأت کے طفیل دریائے خود بینی سے نکل آئے اور پھر آپ نے تمام عمر خود کو رذیل سے رذیل اور گنہگار سے گنہگار آدمی سے بھی کبھی اونچا نہیں سمجھا بلکہ خود کو اس سے کم تر ہی خیال کرتے رہے۔

خدا کی محبت

ایک مرتبہ ایک خوبصورت عورت ننگے سر، ہاتھ منہ کھولے غصہ میں بھری ہوئی آپ کے پاس اپنے شوہر کی شکایت لے کر آئی آپ نے فرمایا: اے نیک بخت پہلے اپنے سر منہ کو ڈھانپ لے پھر شکایت بھی کر لینا۔ عورت شرمندہ ہوئی اور کہا معاف کیجئے میں اپنے شوہر کی محبت میں از خود رفتہ ہو گئی تھی مجھے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا آپ نے اس کی یہ بات سن کر دل میں کہا "اے حسن! اگر تو بھی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی دوستی میں ایسی ہی محویت سے کام لیتا تو تجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ اس عورت کے سر پر کپڑا ہے یا نہیں۔"

اعتراض سے علیحدگی

ایک شخص کے بارے میں لوگوں نے شکایت کی کہ وہ نماز باجماعت میں شامل نہیں ہوتا اور اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے آپ اس کے پاس گئے اور فرمایا اے شخص تجھے ایسا کون سا ضروری کام آپڑا جو تجھے نماز باجماعت میں شریک ہونے اور لوگوں سے ملنے جلنے میں باز رکھتا ہے اس نے عرض کیا۔ میری کوئی سانس اور انسانیت کا کوئی لمحہ معصیت و گناہ سے خالی نہیں اس لیے میں خدا کی بارگاہ میں گریہ زاری میں مصروف رہتا ہوں آپ نے فرمایا اے شخص تو مجھ سے بہتر ہے اور یہ کہہ کر واپس چلے آئے۔

حق گوئی و بے باکی

ایک روز آپ وعظ کہہ رہے تھے اتفاقاً حجاج بن یوسف شمشیر برہنہ لئے چند سپاہیوں کے ساتھ ادھر آ نکلا۔ ایک شخص اس مجلس میں تھا۔ اس نے اپنے دل میں خیال کیا کہ آج حسن بصری کا امتحان کرنا چاہیئے یعنی دیکھنا چاہیئے کہ حضرت حسن حجاج کے سامنے بھی وعظ میں مشغول رہتے ہیں یا اس کی تعظیم کے لیے وعظ سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں اسی اثنا میں حجاج ان کے قریب

آیا اور چاہا کہ آپ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوں لیکن آپ نے حجاج کی طرف اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اسی طرح وعظ فرماتے رہے تب اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ حسن واقعی حسن ہیں جب آپ وعظ کہہ چکے تو حجاج آپ کے پاس گیا اور مصافحہ کر کے لوگوں سے کہنے لگا اے لوگو اگر تم چاہو کہ کسی مرد کو دیکھو تو حسن کو دیکھ لو۔

طریقہ ریاضت

کہتے ہیں آپ کے ایک مرید کی یہ حالت تھی کہ جب قرآن حکیم کی کوئی آیت سنتا تو بیہوش ہو جاتا آپ نے فرمایا کہ تم جو کام کرتے ہو اس میں اس بات کا خیال ضرور رہنا چاہیے کہ آواز نہ ظاہر ہونے پائے کیونکہ آواز کے ظاہر ہونے سے ریاکاری معلوم ہوتی ہے اور مکر و ریا سے انسان ہلاکت میں پڑ جاتا ہے اور جب انسان پر یہ حالت طاری ہو یا اگر وہ یہ حالت ارادہ کر کے بنائے تو اسے وعظ و نصیحت سے مطلق فائدہ نہیں پہنچتا۔

توکل

ایک مرتبہ عمر بن عبد العزیز نے آپ کو ایک خط لکھا جس میں درخواست کی کہ آپ مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمائیں جس سے مجھے ہر کام میں مدد ملے آپ نے جواب میں لکھا کہ اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو چاہیے تمہیں کہ بالکل بے خوف رہو اور اگر وہ مددگار نہیں تو چاہیے تمہیں کہ کسی سے اُمید نہ رکھو۔

مسلمانوں کی حالت

ایک روز آپ نے اپنے دوستوں اور مریدوں سے کہا کہ تم لوگ صحابہ کی مانند ہو سب لوگ خوش ہوئے پھر آپ نے فرمایا میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم سیرت و کردار کے لحاظ سے ان کے مثل ہو بلکہ یہ کہ تمہاری صورت ان سے ملتی جلتی ہے صحابہ کی یہ حالت تھی کہ تم اگر ان کو دیوانہ سمجھتے اور اگر صحابہ کرام تمہاری حالت کو دیکھتے تم میں سے کسی کو بھی مسلمان خیال نہ کرتے کیونکہ وہ حضرات اتنے بڑے اعلیٰ درجے کے مالک تھے کہ گھوڑوں پر سوار پرندوں کی طرح اڑتے اور ہوا کی طرح تیز چلتے ہوئے دنیا سے چلے گئے اور ہم ان لوگوں میں ہیں جو ایسے گدھوں پر سوار ہیں جن کی پشت

زخمی ہے اور اس کی تکلیف سے چلاتے ہیں۔ اور چلنے پر مجبور ہیں۔

آپ نے فرمایا انسان دنیا سے تین حسرتیں لے کر جاتا ہے ایک یہ کہ مال و دولت جمع کرنے سے آسودہ نہ ہوا۔ دوسرے یہ کہ جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ تیسرے یہ کہ آخرت کے سفر کا سامان مہیا نہ کیا۔

آپ نے فرمایا ورع و پرہیزگاری کے تین درجے ہیں ایک یہ کہ غیظ و غضب کی حالت میں بھی سچ بات کہے۔ سچ کو ترک نہ کرے۔ حق بات اختیار کرے دوسرے یہ کہ جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے انہیں پابندی کے ساتھ ادا کرتا رہے تیسرے یہ کہ جن باتوں کی ممانعت ہے انہیں کبھی ہاتھ نہ لگائے۔

عہد خواجہ حسن بصری کے علمی مسائل

جناب خواجہ حسن بصری کا زمانہ دو اعتبار سے مشہور ہے ایک تو یہ کہ آپ کے وقت میں معتزلہ کا گروہ پیدا ہوا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ کے زمانے کے زاہدوں، عابدوں اور گوشہ نشینوں نے صوفی کا لقب پایا اور آگے چل کر اس سلسلے کے جو دوسرے بزرگ پیدا ہوتے انہوں نے تصوف کے مسلک کی باقاعدہ تنظیم کی اور اس کے فروغ و اشاعت کے لئے تصنیف اور تالیف کا آغاز کیا۔

معتزلہ

معتزلہ کے گروہ سے متعلق مختلف روایات ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کے لئے شریروں نے ہوا۔ خونریزیاں شروع کی ہوئی تھیں جس کے باعث ملک میں سخت بے دلی بے اطمینانی اور خوف و ہراس پھیل رہا تھا۔ ہر چند لوگوں کی زبان پر تالے پڑ چکے تھے جان کے خوف سے کوئی شخص جابروں کے سامنے کلمہ حق نہیں کہہ سکتا تھا مگر پھر بھی اس وقت عرب میں کہیں کہیں تھوڑا بہت آزادی کا شعور باقی تھا بعض دیدہ دلیر لوگ متعجب ہو کر بسا اوقات شیطنت کے سرغنوں سے یہ سوال کر بیٹھتے کہ تم مسلمان ہو کر کیوں مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے پر کمربستہ ہو تم نے اپنی خواہشات کے لیے

ہر طرف خون کی ندیاں بہا رکھی ہیں کل خدا کو کیا جواب دو گے؟
کیا تمہیں خدا یاد نہیں؟ وہ جواب میں کہتے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے انسان مجبور محض ہے۔ اس عقیدے کو جبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریروں نے اپنے ظلم وستم پر خاک ڈالنے کے لیے یہ عقیدہ قائم کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گروہ خوارج اور جبریہ کے بعد مسلمانوں میں ردّعمل کے طور پر ایک تیسرا گروہ قدریہ کے نام سے پیدا ہوا جس کے عقیدے کی بنیاد اس پر تھی کہ انسان سے بھلے بُرے جو بھی افعال سرزد ہوتے ہیں ان کا خالق خدا نہیں بلکہ خود انسان ہے۔

خواجہ حسن بصری شہر کی جامع مسجد میں قرآن وحدیث کا درس دیا کرتے تھے ایک روز آپ کے درس میں قدریہ فرقے کا ایک شخص معبد جہنی شریک ہوا جناب خواجہ سے اس نے مسئلہ جبر کا ذکر چھیڑا اور پوچھا کہ اموی اپنے اعمال کے جواب میں جو دلیل بری الذمہ ہونے کی پیش کرتے ہیں کیا آپ کے نزدیک درست ہے؟ خواجہ صاحب نے فرمایا کذب اعداء اللہ یعنی اللہ کے دشمن جھوٹے ہیں۔ مگر معبد جہنی جناب خواجہ کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اس نے چند ایک بے تکے بے معنی سوال اور کر دیئے اس پر آپ نے بیزار ہو کر معبد جہنی سے کہا اعتزل عنا، مجھ سے دور ہو جا کہتے ہیں اس واقعہ سے گروہ قدریہ عوام میں فرقہ معتزلہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔
بعضوں نے یوں لکھا ہے کہ عمر بن عبید اور واصل بن عطا یہ دونوں جناب خواجہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ یہ ایک روز معمول کے مطابق آپ کے درس میں شریک تھے کہ اسی اثنا میں ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں خوارج کے اس عقیدے کا بڑا چرچا تھا "کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔" اس شخص نے آتے ہی سوال کیا اور پوچھا کہ خوارج کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ایک گروہ ایسا بھی آ گیا ہے جس کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان کسی نقصان سے ایسے ہی محفوظ ہے جیسے کفر کی حالت میں کوئی آدمی چاہے کتنی ہی نیکی کرے وہ اسے کچھ فائدہ

نہیں پہنچا سکتی کیا یہ عقیدہ درست ہے؟ خواجہ یہ سوال سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ ابھی منہ سے کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ واصل چلا آیا اور کہنے لگا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے نہ مومن بلکہ درمیانی منزل کا آدمی ہے۔ اور اس کے بعد وہ اور عبیدہ دونوں آپ کے درس سے نکل کر چلے گئے اس پر جناب خواجہ نے خفا ہو کر فرمایا اعتزل عنا یعنی وہ ہمارے حلقے سے دور ہو گیا کہتے ہیں اسی دن سے ان لوگوں کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

بہر کیف واقعہ خواہ کچھ بھی ہو اس پر تو تمام سیرت نگار اور مورخین نے اتفاق کیا ہے کہ معتزلہ ایسے رسوائے زمانہ لقب کی ابتدا جناب خواجہ حسن بصری ہی کی زبان مبارک سے ہوئی لیکن اب ایک معتزلہ کیا جناب خواجہ کا سلوک مسلمانوں کے کسی گروہ سے بھی ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج ہم اپنے عقیدے کے خلاف کسی کو پا کر ایک دوسرے سے شدید تعصب اور عداوت رکھتے ہیں۔

تصوف لفظ صوفی کس سے بنا ہے اور کس سے نہیں؟ اس کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیال ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک صوفی کا لفظ اصل میں صفوی تھا جو کثرت استعمال سے صوفی بن گیا۔ ابوالحسن قناد کہتے ہیں کہ صوفی کا لفظ صفا سے بنا ہے جس کا مطلب ان لوگوں سے ہے جنہیں قدرت نے پہلے ہی سے بشری کدورتوں اور غلاظتوں سے پاک صاف رکھا ہے۔ بعض کہتے ہیں نہیں! جو لوگ سادگی کی وجہ سے صوف کا لباس پہنتے تھے وہ صوفی کہلاتے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اصحاب صفہ کی مناسبت سے صوفی کا لفظ عہد نبوت ہی سے وجود میں آ گیا صفہ کے معنی عربی میں چبوترے کے ہیں وہ لوگ جن کا کوئی در تھا، نہ گھر وہ دن میں کہیں کام کاج کو نکلتے۔ ہاتھ پیر ہلاتے اور اپنے لیے حلال روزی کماتے پھر فارغ وقت میں رسول اللہ سے علم دین حاصل کرتے اور آرام کے وقت مسجد نبوی کے چبوترے پر چلے آتے۔ یہیں رہتے سہتے اور اسی کو اپنا گھر، مسکن اور آرام گاہ سمجھتے تھے انہیں اصحاب صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

استعمال کب ہوا جیسا کہ صوفی کے اشتقاق سے متعلق اختلاف ہے۔ اسی

طرح اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ لفظ صوفی کب استعمال ہوا کسی کے نزدیک صوفی کا لفظ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صوفی کا لفظ محمدؐ رسول اللہ کے زمانے ہی میں پیدا ہوا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کہتے ہیں کہ یہ لفظ جناب محمد رسول اللہ کی رحلت شریف کے بعد رائج ہوا۔ شیخ اکبر کہتے ہیں اور اخبار مکہ میں لکھا ہے کہ صوفی کا لفظ خواجہ حسن بصری کے زمانے میں پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ صوفی کا لفظ خواجہ حسن بصری اور سفیان ثوری کے اقوال میں کئی مرتبہ آیا ہے۔

جو لوگ اس خیال کے حامی ہیں کہ صوفی کا لفظ اسلام سے پہلے بھی تھا، وہ درحقیقت تصوف کے مسلک کا رشتہ یونان سے جا ملاتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف کا مذہب مسلمانوں نے اس وقت اختیار کیا جب یونانی زبان کا عربی میں ترجمہ آیا۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ صوفی کا لفظ یونانی کے لفظ صوف بمعنی حکمت کی محبت سے لیا گیا ہے جناب فریدالدین عطار نے تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک صوفی کا لفظ بغداد کے لوگوں کی ایجاد ہے۔

علامہ ابوریحان البیرونی کتاب الہند میں لکھتے ہیں کہ صوفی کے معنی فلاسفر کے ہیں۔ یونانی زبان میں صوف کے معنی فلسفہ کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی زبان میں فیلسوف کو فیلاف سوفا کہتے ہیں یعنی فلسفہ کا عاشق۔ چونکہ اسلام میں ایک جماعت ایسی موجود تھی جس کا مسلک یونانی صوفیوں کے قریب قریب تھا۔ اس لیے اس کا نام صوفی پڑ گیا۔

علامہ بیرونی کا بیان بہت واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تصوّف کی تحریک کو غیر اسلامی تحریکوں سے مستعار خیال کرتے ہیں۔ وہ دراصل میں التباس لفظی سے دھوکا کھا گئے۔ ورنہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے تصوّف کے محرکات اور صوفیائے اسلام کے طور و اطوار غیر اسلامی تصوّف کے محرکات اور ان کے صوفیوں کے طریقہ کار سے بالکل مختلف ہیں۔

پہلا صوفی

جیساکہ تصوّف اور صوفی کے مسلک کے ماخذ اور استعمال کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسی طرح اس باب میں بھی اختلاف ہے کہ اوّل اوّل کسی بزرگ کو صوفی کا لقب دیا گیا۔ کوئی جناب ابوہاشم المتوفی ۱۵۰ ہجری کو پہلا صوفی قرار دیتا ہے۔ کسی کے خیال میں جابر بن حیان پہلے صوفی ہیں۔ بہرکیف یہ دونوں ہی بزرگ کوفہ کے ہیں اور دونوں دوسری صدی ہجری ہی میں گزرے ہیں۔

جو لوگ تصوّف کے مسلک کو عہدِ رسالت ہی سے قائم ہونے کا خیال رکھتے ہیں ان کے نزدیک صوفی کا لفظ جناب رسالت مآب محمد رسول اللہ کی رحلت شریف کے دو برس بعد رائج ہوا اس کا سبب کیا ہے؟ اسے شیخ سعدی شیرازی کے بزرگ استاد علامہ جوزی نے یوں نقل کیا ہے کہ عہدِ رسالت میں جن لوگوں نے ذاتِ رسالت مآب سے فیضِ باطنی و ظاہری حاصل کیا ان کے لیے صحابی سے بڑھ کر اس وقت کوئی اور لفظ ممتاز یا معزز نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر جو لوگ صحابہ سے فیض یاب ہوئے۔ ان کے لیے تابعی اور پھر تابعین سے جنھوں نے اکتساب کیا ان کے لیے تبع تابعین سے بڑھ کر کوئی لفظ موزوں نہ تھا۔ جب تبع تابعین کا زمانہ بھی گزر گیا۔ صرف وہ لوگ باقی رہ گئے، جنھوں نے تبع تابعین سے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ ان کے لیے صوفی کا لفظ استعمال کیا گیا کیونکہ تبع تابعی کے بعد اگر کوئی لفظ موزوں ہوسکتا تھا تو وہ صرف صوفی کا لفظ ہے۔

تصوّف کے بارے میں یہ بات قطعی طے شدہ ہے کہ دوسری صدی کے آخر میں اس نے ایک نمایاں اور ممتاز مسلک کی صورت پکڑ لی۔ اس دور کے ممتاز صوفیوں میں جناب سفیان ثوری، ابراہیم ادہم، داؤد طائی، فضیل بن عیاض اور عورتوں کے طبقے میں جنابہ رابعہ بصری کے اسمائے گرامی بہت مشہور ہیں۔ علمائے تصوّف نے دوسری ہجری کو صوفیائے قدیم کا دور قرار دیا ہے۔ علامہ جوزی نے لکھا ہے کہ قدیم صوفیا۔ قرآن حکیم، حدیث نبوی، فقہ اور تفسیر کے امام تھے وہ لوگوں کو علوم شرعی کی ترغیب دیتے۔ کتاب وسنّت کی اتباع کرتے اور اس کی تاکید کرتے تھے۔

علامہ جوزی نے خواجہ حسن بصری کی بزرگی کو تسلیم کیا ہے اور انھیں قدیم صوفیا کے امام کی حیثیت دی ہے۔

علامہ شبلی نے خواجہ حسن بصری کی فضیلت علمی کے پیش نظر اس بات پر تعجب کیا ہے کہ جناب امام اعظم ابوحنیفہ نے آپ سے اکتساب علم نہیں کیا۔ حالانکہ ۱۱۱ھ میں جناب خواجہ زندہ تھے۔

جناب خواجہ کا سن رحلت کسی کے نزدیک ۱۱۱ھ ہے کوئی ۱۱۲ھ کہتا ہے کسی نے ۱۱۴ھ لکھا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ جناب خواجہ نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔

اول تو یہ جناب شبلی نعمانی کے نزدیک جو آپ کی تاریخ انتقال ۱۱۱ھ ہے وہ صحیح نہیں دوم یہ کہ خواجہ صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ وعظ و تلقین اور درس و تدریس کے سلسلے کو ختم کر دیا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر ظاہر ہے کہ ابوحنیفہ جناب امام اعظم کو جو حضرت خواجہ حسن بصری کے انتقال کے وقت صرف تیس ۳۰ برس کے تھے آپ سے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا کیونکر موقع ملتا۔

وفات خواجہ حسن بصری نے ۱۱۰ھ میں انتقال کیا۔ بصرے سے دو تین کوس پر آپ کا مزار پر انوار مرجع خلائق ہے۔

خواجہ حسن بصری اپنے خیالات کے آئینے میں

ابن جوزی نے صفوۃ الصفوہ میں آپ کے اقوال نقل ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:۔

خواجہ صاحب نے فرمایا جو نام نہاد مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ سواد اعظم ہمارے ہی جیسا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ جہاں اللہ انھیں بخش دے گا وہاں ہمیں بھی معاف کر دے گا وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اس طرح سے وہ نیک کام کرنے میں سستی سے کام لیتے ہیں اور اس کے فضل و کرم سے محروم رہتے ہیں۔ البتہ خدا کے بارے میں اپنے دل میں من مانی آرزوئیں ضرور پکاتے رہتے ہیں۔

درحقیقت وہ شخص سب سے بڑا فاجر و فاسق ہے جو چھوٹے بڑے سبھی گناہ

کیسے چلا جاتا ہے۔ مگر کہنا جاتا ہے کہ کوئی خطرے کی بات نہیں وہ بخشنہار سب کے گناہ بخشنے والا ہے میرے لیے کوئی کھٹکا نہیں۔

ایک مرتبہ کوفہ کے گورنر ابو ہبیرہ نے جب وہ بصرے کے دورے پر آیا تو آپ کو کسی ضرورت سے یاد کیا آپ جب گورنر سے مل کر واپس ہو رہے تھے تو آپ نے دیکھا کہ چند علما دروازے پر کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ گورنر سے ملاقات ہو یہ دیکھ کر آپ بے ساختہ ان پر ٹوٹ پڑے اور فرمانے لگے "کیا تم ان گندوں اور خبیثوں کے پاس جانا چاہتے ہو۔ بھاگو یہاں سے خدا تمھاری جان کو تمھارے جسم سے علیحدہ کرے۔ تم لوگوں نے اہلِ علم کو رسوا کر دیا۔ خدا تمھیں رسوا کرے۔ خدا کی قسم اگر تم اس چیز سے جو ان امیروں کے پاس ہے۔ بے نیاز ہو جاتے تو جو کچھ تمھارے پاس ہے اس کے یہ طالب ہو جاتے لیکن افسوس ان کے پاس جو کچھ ہے اسی کو تم نے مطلوب بنا لیا اور جو کچھ تمھارے پاس ہے اس سے وہ بے نیاز ہو گئے۔"

میں نے صحابہ کو دیکھا ہے جن کی نظر میں دنیا اس سے بھی زیادہ بے وقعت تھی جتنی بے قدر وقیمت تمھاری نظر میں تمھارے پاؤں کے نیچے کی خاک ہے۔ میں نے ان بزرگوں کو بھی دیکھا ہے کہ جن کے گھر رات آتی اور اتنی غذا کے سوا جو صرف انہی کے لیے کافی ہو ان کے پاس اور کچھ نہ ہوتا اس پر بھی وہ کہتے کہ صرف میں ہی اسے کھالوں۔ تہیں یہ مناسب نہیں بلکہ یہ کروں گا کہ کچھ خود کھاؤں گا اور کچھ اللہ کی راہ میں دے دوں گا۔ حالانکہ اللہ کی راہ میں وہ جو کچھ دیتے تھے۔ اس کے خود بھی زیادہ محتاج ہوتے تھے۔

خدا کی قسم جس آدمی نے صحابہ کرام کو دیکھا ہو۔ قرن اول کو پایا ہو اور پھر وہ تم لوگوں کے درمیان رہ گیا ہو کوئی صورت اس کی نہیں سوائے اس کے کہ صبح کو جب اٹھے تو مغموم اٹھے اور جب شام ہو تو اس وقت بھی مغموم رہے۔

"موت دنیا کو رسوا کر رہی ہے کسی دانشمند کے لئے یہاں مسرت کی گنجائش ہی اس نے کہاں چھوڑی ہے۔"

اے مسلمانو! قرآن حکیم کے بعد پھر کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی۔ تمھارے نبی کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ پس تمھیں چاہیے کہ دنیا کو بیچ کر آخرت خرید لو۔ دین اور دنیا دونوں میں نفع پاؤ گے اور آخرت کو بیچ کر جو شخص دنیا کو مول لے گا اسے دنیا میں نقصان رہے گا اور آخرت میں بھی خسارہ۔

اے آدم کے بیٹے! تجھ پر افسوس ہے۔ کیا تو اللہ سے جنگ کرنے کی اپنے اندر سکت رکھتا ہے۔ دیکھ جو شخص خدا کے احکام سے منہ پھیرتا ہے وہ اللہ سے جنگ کرتا ہے۔

خواجہ صاحب پُرآشوب زمانے کے بزرگ تھے نت نئے فتنے اور فرقے مسلمانوں میں آئے۔ دن اُٹھتے رہتے تھے۔ جنھیں دیکھ دیکھ کر خواجہ صاحب کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ انھیں عمر بھر اسی بات کی جستجو تھی کہ کسی طرح مسلمان آپس میں اختلافات کو ختم کر کے ایک ہو جائیں اور نیک بن جائیں۔ اسی لگن اور دھن میں وہ اپنا تن من سب کچھ بھلا چکے تھے۔ دن رات مسلمانوں کی ہدایت و اصلاح میں لگے رہتے تھے۔ خواجہ صاحب کے ایک شاگرد ابراہیم بن عیسی الیشکری کہتے ہیں "میں نے جناب خواجہ حسن بصری سے زیادہ مغموم آدمی نہیں دیکھا۔ جب ان پر نظر پڑتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی زندہ مصیبت میں گرفتار ہیں۔

اقوال

سعید بن جبیر تابعی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ آپ مجھے چند نصیحتیں فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ تین چیزوں سے تمھیں روکتا ہوں۔ اوّل یہ کہ بادشاہوں سے میل جول نہ بڑھانا، ان کی عنایات پر بھروسہ نہ کرنا۔ کیونکہ انھیں آنکھ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ دوم یہ کہ کسی نامحرم عورت کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا چاہے تم اسے قرآن حکیم ہی کی تعلیم کیوں نہ دو۔ تیسرے یہ کہ دنیا کے کسی راگ رنگ میں نہ پڑنا۔ پس جس نے ان باتوں پر عمل کیا اس نے ہدایت کی راہ پائی۔ نیز آپ نے فرمایا۔

۱۔ بھیڑ آدمی کی آواز پر فوراً نقل و حرکت شروع کر دیتی ہے مگر افسوس آدمی خدا کے حکم پر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

۲۔ بدوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ ورنہ تھوڑی بہت اچھائیاں جو ہیں وہ بھی

ہاتھ سے چلی جائیں گی۔

۳۔ جس نے قناعت کی وہ دنیا سے بے نیاز ہوا جس نے لوگوں سے علیحدگی کی اس نے سلامتی پائی، جس نے شہوت کو ترک کیا وہ آزاد ہوگیا۔ جس نے چند روز صبر اختیار کیا اس نے سعادت پائی۔

۴۔ ورع کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی بات کہے حق کہے۔ چاہے خوشی میں ہو یا غم وغصے میں۔ دوسرے جس چیز میں خدا کا غضب ہو اس سے اپنے تمام اعضا کو نگاہ میں رکھے۔ خدا کا خوف ہر لمحہ دل میں رہے۔ یہ باتیں ہزار سال کی نماز روزہ سے افضل ہیں۔

۵۔ دنیا میں کوئی سرکش گھوڑا تیرے نفس سے زیادہ سخت لگام دینے کے قابل نہیں۔

۶۔ اگر تجھے یہ دیکھنا ہو کہ تیرے بعد دنیا کی حالت کیا ہوگی تو دوسروں کی موت سے عبرت پکڑ اور دیکھ کہ ان کے بعد دنیا کا کیا حال ہے؟

۷۔ جو تنگی میں آگیا، اس سے بڑھ کر کوئی احمق نہیں۔

۸۔ جو شخص دوسروں کی بُرائیاں تیرے سامنے کرتا ہے اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ تیری بُرائیاں دوسروں کے سامنے نہ کرتا ہوگا۔

۹۔ میرے نزدیک برادرانِ دین بیوی بچوں سے زیادہ عزیز ہیں کیونکہ وہ دین کے یار ہیں اور بیوی بچے دنیا کے ساتھی۔

۱۰۔ میرا کلام سُنو کیونکہ میرا علم تمھیں فائدہ پہنچائے گا اور میری بے علمی تمھیں نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

۱۱۔ جس دل میں دنیا کی محبت ہے وہ زندہ نہیں مردہ ہے۔

۱۲۔ جو نماز حضورِ قلب سے نہیں وہ عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

۱۳۔ تقویٰ اور پرہیزگاری دین کی بنیاد ہے مگر طمع اور لالچ اسے کھو دیتا ہے۔

۱۴۔ تم ڈرانے والے کی صحبت اختیار کرو تاکہ کل قیامت میں رحمتِ الٰہی تمھارے قریب ہو۔

۱۵۔ میں لوگوں سے اس بات کی امید نہیں رکھتا کہ وہ مجھے برا نہ کہیں۔ برا کہنے والوں نے تو اللہ کو بھی برا کہا ہے۔

۱۶۔ انسان دوسروں کو نصیحت اس وقت کرے جب خود پاک ہو جائے۔

۱۷۔ قناعت کرنے والا خلق سے بے پروا ہو جاتا ہے۔

۱۸۔ جس نے تنہائی اختیار کی اس نے سلامتی پائی۔

۱۹۔ جس نے حسد کو چھوڑا اس نے دوستی پائی۔

۲۰۔ جس نے صبر اختیار کیا اس نے برخورداری حاصل کی۔

۲۱۔ صبر دو طرح پر ہے۔ ایک مصیبت و بلا پر۔ دوسرے ان باتوں پر کہ جن کے نہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

۲۲۔ جو خاموشی اختیار کرتا ہے اس کا دل ناطق ہو جاتا ہے اور زبان پُر اثر ہو جاتی ہے۔

تصوف کے سلسلے

تصوف کا نام پانے سے پہلے تمام عابدوں اور زاہدوں کو ارباب حدیث کہا جاتا تھا۔ جب لوگوں کو دین کے مسائل پیش آنے لگے اور انھوں نے اپنے مسائل کے حل تلاش کرنے کے لیے ارباب حدیث کی طرف رجوع کیا تو ارباب حدیث میں جن بزرگانِ دین نے قرآن حکیم، سنت نبوی اور صحابہ کرام کے طرز عمل کی روشنی میں ان کے مسائل کا حل تلاش کر کے پیش کیا انھیں مجتہد یا فقیہ کہا گیا۔

مجتہدین یا فقہائے کرام اربابِ حدیث سے کوئی الگ جماعت نہیں بلکہ انہی بزرگانِ دین میں سے ایک جماعت کے افراد ہیں جو مسائل کے استنباط کے لیے شرعی نصوص پر قیاسی نتائج حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ امام اعمش ارباب حدیث و فقہاء کے فرق کو اس طرح بیان کرتے ہیں یا معشر الفقهاء انتم الاطباء ونحن الصيادلة اے فقیہو! تم طبیب ہو اور ہم عطار ہیں۔ ہمارا کام ہے اچھی اچھی دواؤں کا اکٹھا کرنا اور تمھارا کام ہے دوا کی جانچ پڑتال کرنا۔ مرض معلوم کرنا۔ پھر مریض کے مرض اور اس کے مزاج کے مطابق دوا تجویز کرنا۔

مقصد یہ کہ فقہا اور صوفیا علمائے اسلام کے دو الگ الگ یا ایک دوسرے سے متصادم گروہ نہیں تھے بلکہ جس طرح سے فقہا صاحبان کے چار فقہی مکتب خیال ہیں یعنی امام ابوحنیفہ نے حنفی مکتب فقہ قائم کیا۔ امام شافعی نے شافعی۔ امام محمد مالک نے مالکی اور امام احمد بن حنبل نے حنبلی گویا حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ اہل سنت والجماعۃ کے چار مکتب حق ہیں۔ اسی طرح سے وہ ارباب حدیث جنہیں بعد میں صوفیا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ علم تصوف کے مختلف طریقے رکھتے ہیں۔ اور وہ سب کے سب اسی طرح مکاتیب راسخ العقیدہ ہیں کہ جس طرح فقہ کے چاروں مسالک مذاہب حقہ ہیں۔

جناب خواجہ حسن بصری اس اعتبار سے تمام ارباب حدیث میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ یعنی آپ ایک طرف امام الحدیث تھے تو دوسری طرف بصرہ کے سب سے بڑے فقیہ بھی۔ آپ نے فقیہ یا مجتہد کے لیئے حسب ذیل شرطیں مقرر کی ہیں،

اوّل یہ کہ فقیہ وہ ہے جو دنیا سے دل نہ لگائے یعنی دنیا اس کے نزدیک مقصود بالذات نہ ہو۔ دوم آخرت کے امور میں رغبت رکھے۔ سوم دین میں کامل بصیرت حاصل ہو۔ چہارم طاعات پر مداومت کرنے والا ہو۔ پنجم مسلمانوں کی بے آبروئی اور ان کی حق تلفی سے بچنے والا ہو۔ ششم اجتماعی مفاد اس کے سامنے رہے۔ یعنی انفرادی و شخصی مفاد پر قومی و اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتا ہو۔ ہفتم یہ کہ مال و دولت کا اسے لالچ نہ ہو۔

صوفیوں کے بارے میں آپ نے فرمایا جو شخص تواضع اور انکسار سے صوفیوں کا لباس پشمینہ (اونی کپڑا) پہنے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی آنکھ اور دل کے نور میں اضافہ کر دے گا اور جو شخص غرور و نمائش کے لیے پہنے گا اس کو سرکشوں کے ساتھ جہنم میں جھونک دے گا۔

خواجہ صاحب سے تصوف کے جو سلسلے آگے چلے ان میں سے ایک سلسلے کو پنج چشت کہتے ہیں۔ دوسرے سلسلے کو نو قادر کہا جاتا ہے۔ پنج چشت حسب ذیل ہیں،

۱۔ زیدیہ — یہ سلسلہ حضرت خواجہ حسن بصری کے مرید و خلیفہ اول عبدالواحد بن زید کے نام سے موسوم ہے زید نے ۱۷۶ ہجری میں وفات پائی۔

۲۔ عیاضیہ — حضرت عبدالواحد بن زید کے خلیفہ اول جناب فضیل بن عیاض کے نام سے موسوم ہے۔ عیاض نے ۱۸۷ ہجری میں انتقال کیا۔

۳۔ ادھمیہ — یہ سلسلہ جناب فضل عیاض کے خلیفہ اول جناب ابراہیم ادھم سے چلا ابراہیم نے بادشاہت کو لات مار کر فقیری اختیار کی۔ ۱۶۲ ہجری میں رحلت فرمائی۔

۴۔ ہبیرۃ البصری — یہ سلسلہ جناب خواجہ حذیفہ مرعشی کے واسطے سے جناب ابراہیم ادھم تک پہنچتا ہے۔ ہبیرۃ البصری ۲۸۷ھ میں فوت ہوئے۔

۵۔ چشتیہ — یہ سلسلہ جناب خواجہ اسحاق چشتی کے نام سے موسوم ہے اور یہ خواجہ ممشاد علو دینوری کے واسطے سے ہبیرۃ البصری تک پہنچتا ہے۔

سلسلہ نو فادر کی تفصیل اس طرح سے ہے۔

۱۔ حبیبیہ — یہ سلسلہ جناب خواجہ حسن بصری کے مرید و خلیفہ جناب حبیب عجمی کے نام سے موسوم ہے۔ حبیب عجمی نے ۱۵۶ھ میں وفات پائی۔

۲۔ طیفوریہ — یہ سلسلہ جناب حبیب عجمی کے خلیفہ و مرید جناب طیفور بسطامی المعروف بایزید بسطامی کے نام سے موسوم ہے۔ بسطامی نے جناب امام جعفر صادق سے روحانی توجہ حاصل کی اور امام علی موسیٰ رضا سے خرقہ خلافت پایا۔ آپ نے ۲۶۰ ہجری میں انتقال کیا۔

۳۔ کرخیہ — یہ سلسلہ جناب معروف کرخی سے چلا جو حضرت خواجہ داؤد طائی کے واسطے سے جناب حبیب عجمی کے مرید تھے۔ آپ نے ۲۰۰ ہجری میں وفات پائی۔

۴۔ سقطیہ — یہ سلسلہ حضرت معروف کرخی کے مرید و خلیفہ جناب سری سقطی کے

نام سے موسوم ہے۔ سری سقطی نے ۲۵۴ ہجری میں وفات پائی۔

۵۔ جنیدیہ یہ سلسلہ جناب شیخ سری سقطیؒ کے خلیفہ اول جناب جنید بغدادی سے قائم ہوا۔ جناب جنید بغدادی نے ۲۹۸ ہجری میں انتقال فرمایا۔

۶۔ گاؤزرونیہ یہ سلسلہ جناب جنید بغدادی کے مرید خلیفہ کے مرید کے مرید جناب ابو اسحاق گاؤزرونی کے نام سے موسوم ہے۔ یعنی جنید بغدادی کے مرید خواجہ ممشاد علو دینوری ان کے مرید و خلیفہ حسین ابو علی الاکاران کے مرید جناب ابو اسحاق گاؤزرونی تھے۔

۷۔ طوسیہ یہ سلسلہ جناب علاء الدین طوسی کے نام سے موسوم ہے۔ طوسی نے ۵۶۰ ہجری میں وفات پائی۔ آپ جناب وجیہہ الدین ابو حفص عمرو طرطوسی کے مرید و خلیفہ تھے۔ طرطوسی جناب خواجہ عبداللہ خفیف کے مرید تھے۔ خفیف خواجہ احمد دینوری کے۔ احمد دینوری خواجہ ممشاد علو دینوری کے اور یہ جناب جنید بغدادی کے مرید و خلیفہ تھے۔

۸۔ سہروردیہ یہ سلسلہ جناب خواجہ ابو نجیب سہروردی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ خانوادہ نو واسطوں سے جناب حبیب عجمی تک پہنچتا ہے۔ ابو نجیب جناب طرطوسی کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ نے ۵۶۳ ہجری میں انتقال کیا۔

۹۔ فردوسیہ جناب ابو النجیب سہروردی کے خلیفہ و مرید جناب نجم الدین فردوسی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے ۶۱۸ ہجری میں انتقال فرمایا۔

سلاسل تصوف پس معلوم ہوا کہ تصوف کے تمام سلسلے جو حضرت خواجہ حسن بصری سے شروع ہوئے آپ ہی کے واسطے سے جناب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ تک پہنچتے ہیں۔

ہفت گروہ بعضوں نے بیان کیا ہے کہ خانوادہ فقر جو حضرت علیؓ کی ذات مبارک سے فیض یاب ہوئے سات ہیں۔

اوّل امام حسن۔ دوم امام حسین سوم خواجہ حسن بصری۔ چہارم خواجہ کمیل بن زیاد

پنجم خواجہ اویس قرنی. ششم قاضی شریح. ہفتم خواجہ عبداللہ علمبردار. پھر ان بزرگوں سے آگے چودہ خانوادے ہوئے. بعضوں نے جناب امام حسن اور جناب امام حسین کے بجائے سلمان فارسی اور ابوذر غفاری کی ذات کو فقر کے ہفت گروہ میں شامل کیا ہے.

چار سلسلے

پاک و ہند میں اس وقت جو سلسلے ملتے ہیں وہ صرف چار ہیں. (۱) چشتی (۲) قادری (۳) سہروردی (۴) نقشبندی. تصوف کے ان چاروں سلسلوں کی حیثیت وہی ہے جو فقہ کے چاروں مذاہب کی ہے.

چشتی سلسلے نے ہندوستان میں مقبولیت حاصل کی. نقشبندی اور قادری سلسلہ خراسان ماوراالنہر اور مکہ و مدینہ میں مقبول ہوا. سہروردی سلسلہ زیادہ تر توران و کشمیر میں پھیلا.
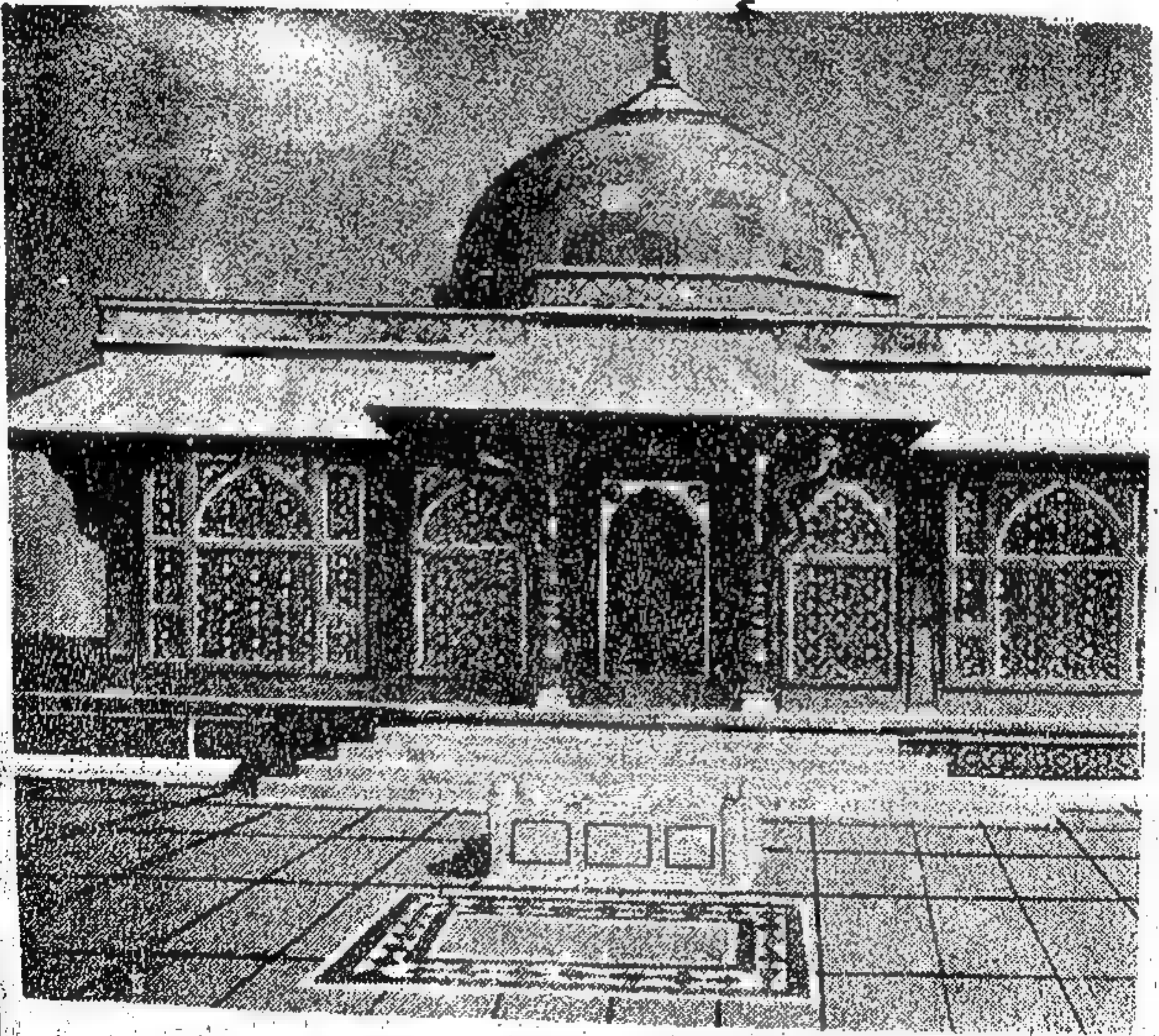
فتح پور سیکری میں درگاہ حضرت سلیم چشتیؒ
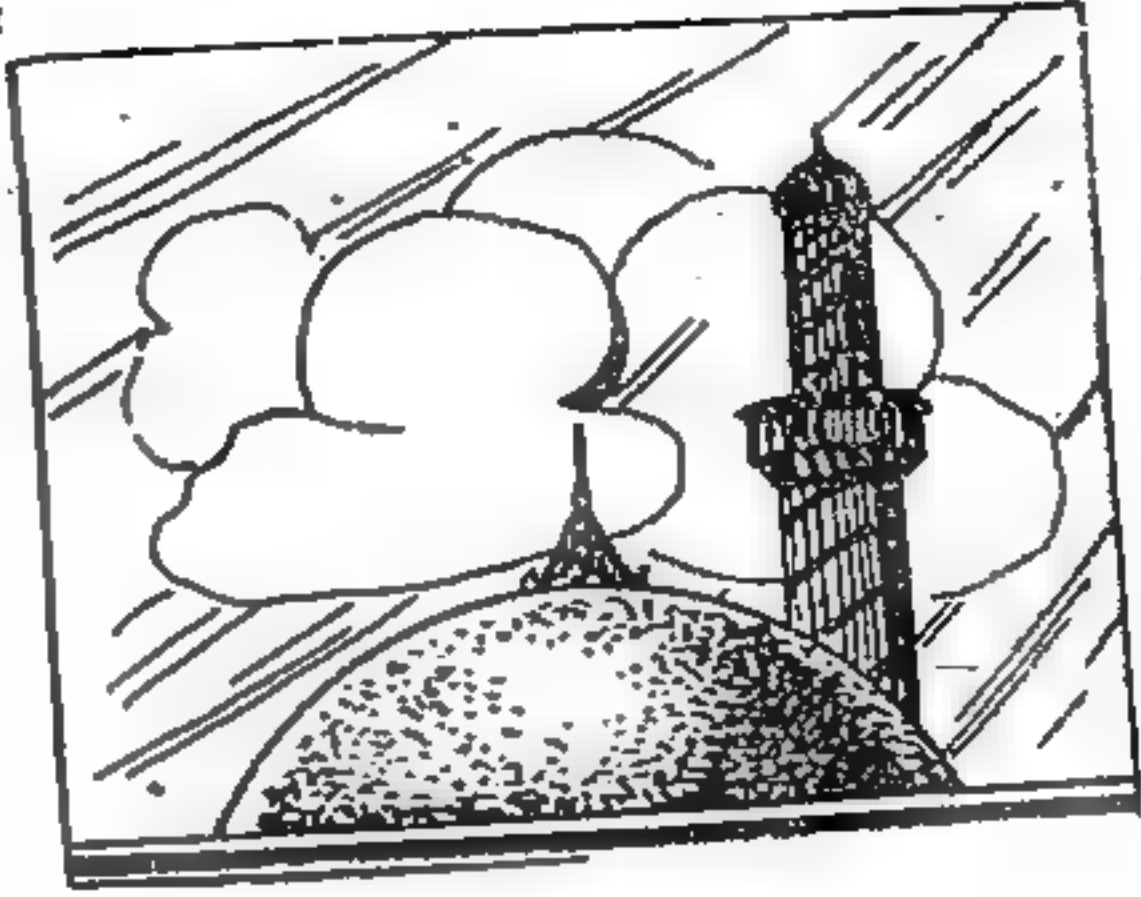
حضرت رابعہ بصریؒ

رابعہ کہتے ہیں چوتھے کو۔ آپ کے والد محترم جناب اسماعیل نہایت عابد و زاہد اور بڑے متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ جناب رابعہ سے پہلے آپ کے تین بیٹیاں تھیں ان کے بعد جب آپ کی ولادت ہوئی تو چار بیٹیاں ہو گئیں۔ چنانچہ آپ کے والد محترم نے اسی رعایت سے آپ کا نام رابعہ رکھا۔

رابعہ کا اسم گرامی اسلام کی ان پاکیزہ اور نیک خواتین میں شمار ہوتا ہے جن کی ابتدا سے لے کر آخر تک تمام زندگی فقر و غنا سے عبارت ہے۔

رابعہ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کی عملی تفسیر تھا۔ آپ کے والد محترم زمانے کی سختیاں سہتے، فاقے کرتے مگر نہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتے اور نہ قدرتِ خدا کی شکایت کرتے۔

ظاہر ہے ایسے صابر و شاکر باپ کی بیٹی جو فطرتاً عابدہ و زاہدہ بھی شروع ہی سے تھی وہ ہر آنے والے زمانے میں اپنے وقت کی صاحبِ عظمت اور خدا رسیدہ خاتون کیونکر نہ ہوگی۔

رابعہ کے والد ایک مفلوک الحال شخص تھے۔ عالم یہ تھا کہ جس رات آپ کی ولادت ہوئی کپڑا لتہ تو ایک طرف، گھر میں اتنا بھی نہیں تھا کہ چراغ جلایا جا سکتا۔
رابعہ کی والدہ نے جناب اسماعیل سے کہا کہ جائیے فلاں پڑوسی کے ہاں سے تھوڑا سا تیل مانگ لائیے۔ یہ عہد کر چکے تھے کہ میں کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اور بقول علامہ اقبالؒ

ع خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

کے مصداق خود کو دست سوال دراز کر کے دوسروں کی نگاہوں سے نہیں گراؤں گا مگر اب موقع کی نزاکت اور بیوی کے اصرار پر بادل نخواستہ ایک پڑوسی کے گھر پہنچے مگر پھر وہاں سے خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ بیوی نے پوچھا۔ کیوں کیا ہوا؟ بولے وہ دروازہ نہیں کھولتا۔
جناب اسماعیل کو پڑوسی کی اس بے مہری اور اپنا سوال اس کے ہاں لے جانے کا بے حد قلق تھا۔ اسی عالم میں سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی۔ خواب میں جناب محمدؐ رسول اللہؐ کی زیارت ہوئی۔ جب آنکھ کھلی تو جو کچھ خواب میں دیکھا اور یاد تھا اسے ایک پرچے پر لکھ کر امیر بصرہ کے پاس بھیج دیا۔ امیر نے مضمون پڑھتے ہی حکم دیا کہ دس ہزار درہم فقیروں کو اس شکرانے میں دے دیئے جائیں کہ جناب محمد رسول اللہؐ نے مجھے یاد فرمایا۔ اور چار سو دینار اس مرد کو دے آؤ اور اسے میرے پاس بلا لاؤ۔ پھر وہ فوراً ہی بولا نہیں نہیں یہ بے ادبی ہے۔ جسے جناب محمدؐ رسول اللہؐ کی زیارت نصیب ہو مجھے اس کی خدمت میں خود پہنچنا چاہیے چنانچہ امیر بصرہ اسمٰعیل کے گھر پہنچا۔ ملاقات کی چلتے ہوئے یہ پیشکش کر دی کہ آپ کو جس شے کی ضرورت پڑے مجھے اطلاع کروا دیجئے۔
قدرت خدا کی جب رابعہ ذرا سیانی ہوئیں تو ماں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب یہ زمانہ آپ کے امتحان و ابتلاء کا شروع ہوا۔ ایک مرتبہ بصرے میں ایسا قحط عظیم پڑا کہ لوگ بچوں اور عورتوں کو اٹھا اٹھا کر لے جانے اور بیچنے لگ گئے۔ رابعہ بصری کی تین بڑی بہنیں معلوم نہیں کیا ہوا کہاں گئیں وہ اس قحط کی نذر

ہو گئیں۔ خود رابعہ کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک بے رحم ڈاکو انہیں پکڑ کر لے گیا۔ چند روز اپنے پاس رکھا پھر آپ کو ایک اور آدمی کے ہاتھ بیچ دیا۔

یہ شخص بڑا سنگدل تھا۔ آپ سے اکثر بڑی محنت و مشقت کے کام لیتا تھا۔ اکثر بھوکا پیاسا رکھتا۔ آپ اس کی خدمت کرتیں۔ مصائب اٹھاتیں مگر منہ سے اُف تک نہ کرتی تھیں۔ آپ ایک مرتبہ کسی کام کے لئے کہیں جا رہی تھیں کہ کوئی نامحرم سامنے آگیا۔ آپ اسے دیکھ کر بے تحاشا بھاگیں اور بھاگتے بھاگتے گر پڑیں اور ہاتھ ٹوٹ گیا۔ پروردگار کی بارگاہ میں کھڑی ہوئیں، رو رو کے عرض کیا خدایا! میں غریب و یتیم اور قیدی ہوں۔ اب ہاتھ ٹوٹ گیا۔ لیکن مجھے اس کا غم نہیں۔ معلوم نہیں تو مجھ سے راضی بھی ہے کہ نہیں میں صرف تیری رضا چاہتی ہوں اور اگر مجھے یہ حاصل ہو جائے تو مجھے کچھ فکر نہیں۔

ایک رات جناب رابعہ خدا کے حضور میں سربسجود تھیں کہ اتفاق سے مالک جاگ رہا تھا۔ اس نے کوئی آواز سنی تو اس نے غور سے دیکھا کہ رابعہ سجدے میں رو رو کے عرض کر رہی ہیں۔ خداوند تو جانتا ہے کہ میرے دل کی خواہش تیرے احکام بجالانے کی ہے اور آنکھوں کی روشنی تیری درگاہ کی خدمت میں ہے۔ اگر میں خود مختار ہوتی تو ہر وقت تیری عبادت کرتی لیکن تو نے مجھے چونکہ اپنی مخلوق کا ماتحت بنایا ہے اس لیے تیری بارگاہ میں دیر سے حاضر ہوتی ہوں۔

مالک نے رابعہ کے یہ کلمات سنے تو ان کی تاثیر سے اس کا مردہ ضمیر جاگ اُٹھا۔ شعور بیدار ہوا۔ صبح ہوئی تو دست بستہ اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا اور بصد ادب عرض کیا کہ آپ میری طرف سے آزاد ہیں۔ یہاں رہیں تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ جانا چاہیں تو آپ کو اختیار ہے۔

مکہ و مدینہ کے بعد بصرہ و کوفہ (کہ جناب عمر فاروق کے حکم سے آباد کیے گئے) اسلامی علوم کے دو بڑے مرکز تھے۔ ہر چند بصرے میں آپ نے بڑی تکلیفیں اُٹھائیں طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت کیے۔ تاہم آپ کو بصرے کے در و دیوار سے

ایک انس تھا۔ ایک والہیت تھی۔ آزادی پانے کے بعد اب آپ کی علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ آپ نے علمائے اسلام سے تھوڑی ہی مدت میں قرآن حکیم اور فقہ و حدیث جملہ اسلامی علوم سیکھ لیے۔ اور ان میں یہاں تک مہارت پیدا کی کہ بڑے بڑے علماء پر فوقیت حاصل ہو گئی۔

امام سفیان ثوری، امام مالک بن دینار اور امام بلخی ایسے خدا پرست عالم باعمل اور عابد و زاہد بزرگ آپ کے ہم نشینوں میں شامل تھے اور اکثر مسائل میں آپ سے مشورے کیا کرتے تھے۔ مختصراً یہ کہ جو مقام آپ نے علمی اعتبار سے پیدا کیا وہی مقام زہد و اطاعت میں حاصل کیا۔ اکثر ساری ساری رات عبادت و مناجات میں گزار دیتیں۔ امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو میں رابعہ بصری کے ہاں مہمان تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ عبادت کے لئے شام سے مصلے پر کھڑی ہوئیں اور صبح کر دی۔ ایک گوشے میں علیحدہ ہو کر میں نے صبح کی نماز ادا کی۔ اولیائے کرام کی سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ۔

جناب رابعہ بصری نے جناب خواجہ حسن بصری کی مجلسوں کو سنا ہے، ان کی خدمت میں حاضر ہوتی رہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ رابعہ کے تجرّد اختیار کرنے کا سبب جناب خواجہ کے مسلک کی پیروی کے غلبہ کا نتیجہ تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔

البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دنیا سے بے پروائی یقیناً جناب خواجہ کی صحبت سے پائی ہوگی۔ رابعہ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز تھیں۔ خدا کے حضور ہر وقت حاضر رہنے اور خیال عصیاں پر دن رات آنسو بہانے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا۔

فریدالدین عطار نے ایک امیر کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جناب خواجہ حسن بصری رابعہ بصری کی زیارت کے لیے آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک امیر کبیر شخص نہایت افسردہ آزردہ کھڑا ہے۔ خواجہ نے ماجرا پوچھا تو وہ کہنے لگا۔ میں دیناروں کی ایک تھیلی نذر کے لیے لایا ہوں مگر جناب رابعہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہو سکے تو

آپ ہی میری سفارش کر دیجیے۔ خواجہ اندر گئے اور اس کا یہ پیغام پہنچایا۔ رابعہ نے روتے ہوئے کہا پروردگار جانتا ہے کہ میں اس سے دنیا مانگتے ہیں عار محسوس کرتی ہوں حالانکہ وہ تمام دنیا کا مالک ہے بھلا ایسے شخص سے کیونکر کچھ لوں جو اس کا مالک نہیں ہے۔

یہ حکایت تو اپنی جگہ پر قطعی درست ہے لیکن یہ واقعہ خواجہ کا نہیں ہے خیال کیجیے کہ جناب رابعہ کی ولادت ۹۵ھ میں یا ۹۹ھ میں ہوئی ہے اور وفات ۱۸۰ھ یا ۱۸۵ھ میں پائی۔ جناب خواجہ کا انتقال ۱۱۰ھ میں ہوا ہے اس وقت جناب رابعہ کی کیا عمر ہوگی، کب تحط پڑا۔ مصائب میں گرفتار ہوئیں۔ اس کے بعد رہائی پائی اور طبیعت میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ یعنی دنیا کو ٹھکرانے اور دل سے بیزار ہو جانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ تمام واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ جس وقت امیر بصرہ دیناروں کی تھیلی لے کر حاضر ہوا ہے اس وقت جناب خواجہ اس دنیا سے بہت پہلے جا چکے تھے۔ اصل میں یہ واقعہ امام سفیان ثوری کا ہے۔ وہی اکثر و بیشتر آپ کے پاس آتے جاتے تھے اور وہی اس موقع پر جناب رابعہ کی زیارت کو آئے تھے۔

رابعہ بصریہ کے سن ولادت کے متعلق سیرت نگاروں میں اختلاف ہے کسی نے ۹۹ھ لکھا ہے۔ کسی نے ۹۵ھ بیان کیا ہے۔ اسی طرح وفات کے متعلق بھی مختلف خیال ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ۱۶۰ھ میں انتقال کیا کسی نے لکھا ہے ۱۸۰ھ میں پیام اجل کو لبیک کہا۔ کسی کے نزدیک ۱۸۵ھ میں رحلت فرمائی۔

خواجہ حسن بصری کے واقعات میں خواجہ فریدالدین عطار نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ جب تک رابعہ الیسی ایک ضعیف عورت نہیں آتی اس وقت تک آپ وعظ نہیں کہتے۔ اس کا سبب ؟ آپ نے فرمایا ہاتھیوں کی غذا چیونٹیوں کو کیسے مل سکتی ہے ؟

یہاں سوال اس سے نہیں کہ آپ نے کیا جواب دیا اور لوگوں نے آپ سے کیا پوچھا بلکہ کہنا یہ ہے کہ اگر مندرجہ ولادت رابعہ کی تاریخیں درست کر لی جائیں تو

خواجہ حسن بصری کہ جن کا انتقال ۱۱۰ھ میں ہوا ہے یا مان لیا جائے کہ ۱۱۱ھ ۱۱۲ھ یا ۱۱۴ھ میں وفات پائی تو خواجہ کی رحلت کے وقت رابعہ کی کیا عمر ہو گی ؟ خیال تو یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی خواجہ حسن بصری کے زمانے کا نہیں بلکہ امام سفیان ثوری کے وقت کا ہے۔
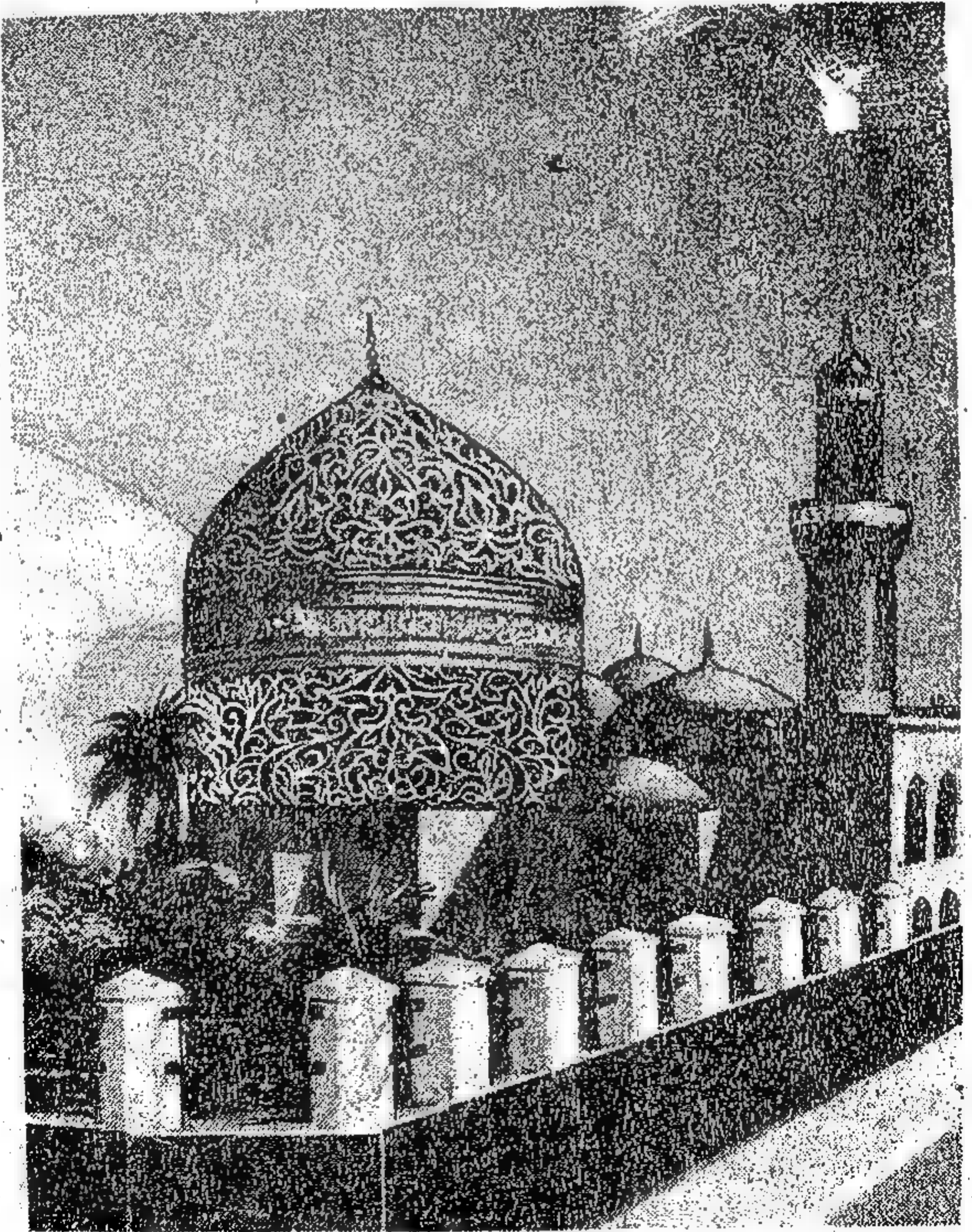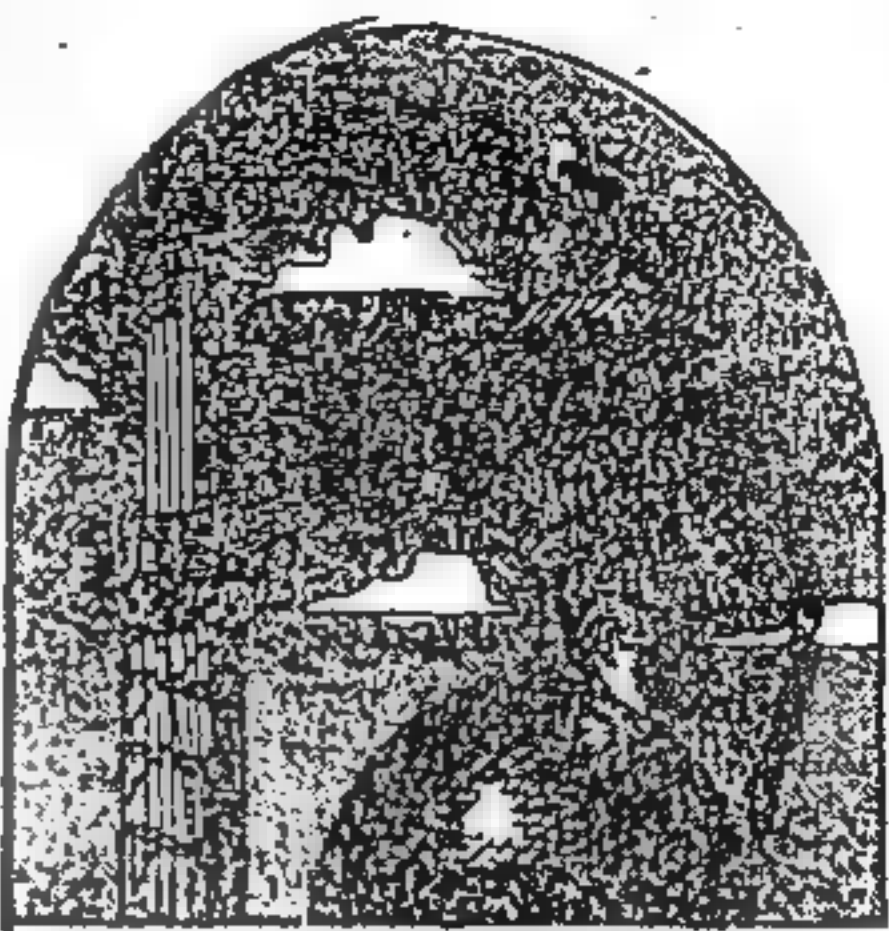
حضرت امام سفیان ثوریؒ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب امام سفیان ثوری کے بھی مختصراً حالات بیان کر دیں جن سے اندازہ ہو سکے کہ آپ کس مرتبہ کے بزرگ تھے۔

نام: سفیان۔ کنیت: ابوعبداللہ۔ ۷۵ھ کوفے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام سعید تھا۔ وہ ثور بن مناۃ کی اولاد سے تھے۔ اسی لیے آپ سفیان ثوری کے نام سے مشہور رہیں۔

حافظ ابن حجر اور خطیب بغدادی نے آپ کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ آپ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپ ائمہ فقہ وار باب حدیث میں گل سر سبد کی حیثیت رکھتے ہیں علم و فضل اور زہد و اتقا میں آپ ضرب المثل تھے۔ آپ کے بارے میں تمام تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "دنیا ان کی طرف بڑھی مگر آپ نے دنیا سے نظر پھیر لی۔"

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ آپ جناب امام اعظم ابوحنیفہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ لیکن یہ بیان درست نہیں۔ جناب ابوحنیفہ ۸۰ھ میں

پیدا ہوئے۔ اس حال میں کون دارا شکوہ کا بیان صحیح تسلیم کر سکتا ہے؟

جناب امام اعظم کے نزدیک سفیان ثوری کا بڑا بلند مرتبہ تھا۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام اعظم سے کہا، آپ نے سُنا ہے کہ سفیان ثوری نے کیا روایت کی ہے؟ امام نے فرمایا کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ سفیان حدیث کی تلاوت میں غلطی کرتے ہیں۔ بخدا وہ ابراہیم نخعی (امام اعظم کے استاد) کے زمانے میں بھی ہوتے، تو بھی لوگ حدیث میں ان کے محتاج ہوتے۔

واقعہ یہ ہے کہ امام سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام مالک۔ ان کے علاوہ خواجہ حسن بصری کے اکثر تلامذہ جناب امام اعظم کے معاصرین میں سے ہیں۔ جناب سفیان ثوری کو ہم عصر ہونے کے علاوہ اس بات کا بھی فخر حاصل ہے کہ امام اعظم کے اکثر شاگردوں نے آپ سے حدیث پڑھی ہے۔ مثلاً:

امام محمد بن حسن کہ امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ جناب سفیان ثوری سے بھی پڑھتے رہے ہیں۔ اور ایک امام محمد کیا اور بھی بہت سے ہیں جنھوں نے آپ سے پڑھا۔ سیرت نگاروں نے جابجا اس کا ذکر کیا ہے۔ اصل میں جناب امام سفیان ثوری کے استاد مشہور تابعی جناب ہشام بن عروہ ہیں۔ امام سفیان ثوری کے علاوہ۔ امام مالک اور سفیان ابن عیینہ بھی انہی کے شاگرد ہیں۔

جناب ہشام بن عروہ کے علاوہ امام سفیان ثوری نے سلیمان بن مہران معروف بہ اعمش سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جناب اعمش نے انس بن مالک سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے اور عبداللہ بن ادنیٰ سے انھوں نے حدیث سُنی ہے:

جناب اعمش سے امام سفیان ثوری کے علاوہ جناب امام شعبہ نے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ یہ شعبہ وہی بزرگ ہیں جن سے امام اعظم جناب ابوحنیفہ نے فتوے اور روایت کی اجازت حاصل کی۔ انہوں نے ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ سفیان ثوری نے آپ کو امام الحدیث تسلیم کیا ہے۔ اور آپ کے انتقال پر کہا لو آج شعبہ پر فن

حدیث ختم ہوا، معلوم نہیں امام اعظم کو استاد داراشکوہ نے کس بنیاد پر لکھا ہے۔
تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ جناب سفیان ثوری کے مزاج میں دنیا اور دنیا والوں سے بے انتہا بے نیازی تھی جس زمانے میں منصور عباسی نے امام اعظم کو بغداد کا قاضی مقرر کرنا چاہا۔ انھی دنوں خلیفہ کی جگہ انتخاب میں آپ بھی آ گئے تھے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کے ساتھ آپ کو بھی دربار میں طلب کیا گیا۔

امام سفیان ثوری کے بارے میں امام الحدیث سفیان بن عیینہ کا قول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان سے بڑھ کر کوئی شخص علم و تقویٰ میں نہیں دیکھا۔ چنانچہ امام خود بھی فرماتے ہیں کہ میں نے مسلسل تیس برس راتیں جاگ کر علم کے حصول کے لیئے کوشش کی ہے۔ آنحضرت صلعم کی جو حدیث مجھ تک پہنچی ہے میں نے اس پر عمل کیا ہے اور ایسی ایک بھی حدیث نہیں جسے میں نے سنا ہو اور اس پر عمل نہ کیا ہو۔

سفیان ثوری کو اگر ان کی سیرت کے آئینہ میں دیکھا جائے تو آپ مجسم علم نظر آئیں گے اور علم بھی وہ کہ جس کا دوسرا نام صرف عمل ہے۔
امام سفیان ثوری بڑے درویش صفت عالم اور تصوف کے سلسلے کے بہت اونچے بزرگ تھے۔ انھیں اللہ پر توکل تھا۔ فقر و غنا کی دولت حاصل تھی۔ ان کی زندگی کی یہ سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ لوگ اکثر تحفے تحائف لے کر ان کی خدمت میں پہنچتے اور آپ نہایت بے پروائی کے ساتھ واپس کر دیتے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اس بات کا یقین کامل ہو جائے گا کہ اس دنیا میں کوئی شخص کسی آدمی کا محتاج نہیں تو میں ضرور لوگوں کے تحفے قبول کر لوں اور جو کچھ وہ لاتے ہیں وہ لے لوں یا ان سے کوئی شے طلب کر دوں لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب ہر شخص ایک دوسرے

کا محتاج ہے اور ہر آدمی ضرورت مند ہے کوئی شخص کسی کا حاجت روا نہیں تو پھر میں کیوں کسی سے کچھ مانگوں اور طلب کر کے اس کا احسان اٹھاؤں۔ میں کیوں نہ اس کی بارگاہ سے مانگوں اور سوال کروں جو کبھی کسی کے سوال کو رد نہیں کرتا اور کبھی اپنی نعمتیں عطا کرتے کرتے نہیں تھکتا۔

کہتے ہیں ایک نوجوان حج کو چلا لیکن راستے میں کسی مجبوری نے اُسے روک لیا۔ اسے حج کی سعادت سے محروم ہو جانے کا بڑا قلق تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری جناب سفیان ثوری اس کے پاس کھڑے تھے۔ آپ نے اس نوجوان سے فرمایا میں نے چار حج کیے ہیں۔ جاؤ ان کا ثواب تجھے بخشتا لیکن ایک آہ جو تو نے بھری ہے، وہ مجھے دے دے۔

آپ فرماتے ہیں کہ صرف ٹاٹ کے کپڑے پہننے اور جو کی روٹی کھانے کا نام فقر نہیں اور نہ اُسے زہد و عبادت ہی کہا جا سکتا ہے بلکہ فقر نام ہے دنیا میں رہ کر دنیا میں دور رہنے کا۔ ممکن ہے بعضوں کو غلط فہمی ہو کہ جناب سفیان ثوری رہبانیت یا دنیا سے ترک تعلق کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ نہیں ان کا مطلب صرف یہ ہے، بقول شاعر ع

بہ گیر رسم تعلق ز لازم مرغابی
کہ او ز آب چو برخاست خشک پر برخاست

یعنی انسان دنیا میں اس طرح سے رہے جیسے مرغابی پانی میں رہتی ہے کہ جب پانی سے باہر نکلتی ہے، پر خشک ہوتے ہیں۔

امام سفیان ثوری نے تمام عمر قرآن و حدیث کا درس دیا ہے۔ جس شان کی کتاب موطا امام مالک نے لکھی اور سفیان عینیہ نے الجوامع فی السنن والآداب لکھی۔ قریب قریب اسی شان کی کتاب، امام سفیان ثوری نے الجامع الکبیر فی الفقہ و الاحادیث لکھی ہے۔

امام سفیان کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ انسان جس حال میں بھی رہے خدا کا شکر

ادا کرتا رہے۔ اگر اس پر کوئی آفت بھی آجائے تو خدا سے اس کا شکوہ نہ کرے اور نہ خدا کو کوئی الزام ہی دے۔

امام سفیان ثوری نے ۲ شعبان ۱۶۳ھ میں انتقال کیا اور بصرے میں مدفون ہوئے۔

آپ کے حالات زندگی میں جیسا کہ منصب قضا قبول کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ والوں کی نگاہ میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں۔

خلیفہ منصور نے منصب قضا تفویض کرنے کے لیے جن بزرگوں کے ساتھ سفیان ثوری کو بھی طلب کیا تھا۔ اس سے ان کی گوشہ نشینی و ناموری اور دنیا سے بے تعلق رہنے کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔ ہر چند سفیان ثوری اس ذمہ داری کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر بحکم حاکم مرگ مفاجات دربار میں حاضر ہوئے۔ لیکن بجائے اس کے کہ منصور سے صریحاً انکار کرکے خدا واسطے کا بیر مول لیتے۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر بہکی بہکی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دیوانہ خیال کیے گئے اور منصب کے قبول کرنے سے رہائی مل گئی۔

اس واقعہ سے یہ اندازہ نہ لگا لیجئے کہ آپ صاف بات کہنے کی اپنے اندر طاقت نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی دلیری و بے باکی تو یہ تھی کہ بڑے بڑے بادشاہوں کے سامنے کھری کھری اور بے لاگ باتیں کہنے سے کبھی نہیں جھجکتے تھے۔ بلکہ چاہتے یہ تھے کہ اس معاملے میں ایسی چال چلی جائے کہ جس سے بگاڑ بھی نہ ہو اور بات بھی بن جائے ورنہ طبیعت کی جرأت کا عالم تو یہ تھا کہ ایک مرتبہ مسجد حرام میں منصور سے مڈبھیڑ ہو گئی خلیفہ منصور نے ان کا ہاتھ پکڑ کر خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے کہا "قسم ہے آپ کو اللہ کے اس گھر کی سچ سچ کہیے کہ آپ نے مجھے کیسا پایا؟" آپ نے فوراً بے دھڑک جواب دیا "قسم ہے مجھے اس گھر کے رب کی، میں نے آپ کو بدترین آدمی پایا۔"

ایک مرتبہ حج کے دنوں خلیفہ مہدی سے ملاقات ہوئی۔ جب لوگ خلیفہ کی

تعریف اور توصیف میں لگے ہوئے تھے اور خلیفہ کی خوبیاں بیان ہو رہی تھیں تو آپ نے فرمایا اے خلیفہ عمر ابن خطاب نے حج کیا تو صرف سترہ دینار خرچ کیے آپ نے حج کیا ہے تو سارا بیت المال ہی خرچ کر ڈالا۔ کہتے ہیں مہدی یہ سن کر بہت خفا ہوئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی جناب سفیان ثوری پر دُنیا تنگ ہو گئی۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی جان بچانے کے لیے غریب الوطن ہونا پڑا اور غربت ہی میں آپ نے انتقال کیا۔[1]

جناب سفیان ثوری کی آزادی و بے باکی کا اس واقعہ سے بھی ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن دنوں شام میں کوئی حضرت علیؓ کا نام تک نہیں لیتا تھا یہ ان دنوں وہاں حضرت علیؓ کے فضائل بیان کرتے۔ اسی طرح عراق پہنچے، جہاں حضرت عثمانؓ کا کوئی نام لینے والا نہیں تھا۔ تو یہاں حضرت عثمانؓ کے مناقب کا ذکر کرتے اسی طرح کوفے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ اور بصرے میں جناب عمر فاروق کے محامد و مناقب بیان کرتے کہ یہاں کوئی صدیقؓ و فاروق کا نام نہیں لیتا تھا۔

امام احمد بن حنبلؒ نے جناب سفیان ثوری ہی کے شاگردوں سے تعلیم پائی ہے۔ سفیان ثوری کی بیشتر حدیثوں کا حصہ انہیں زبانی یاد تھا۔ اگرچہ انھیں سفیان ثوری کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا تاہم معنوی لحاظ سے جناب امام اگر انھیں اپنا استاد سمجھتے ہیں تو حق بجانب ہیں۔

ایک مرتبہ کسی نے امام احمد بن حنبلؒ سے یہ دریافت کیا کہ امام کون ہیں؟ فرمایا امام ایک ہی ہیں اور وہ ہیں سفیان ثوری خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ ان کے درس کی سب سے پہلی مجلس جو اشتاق میں قائم ہوئی اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ المختصر یہ کہ جناب امام سفیان ثوری علم و عمل کے اعتبار سے بہت بلند مرتبے کے بزرگ تھے۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ ان کا مرتبہ علم و فضل کے لحاظ سے زیادہ بلند تھا۔ یا سیرت اور کردار کے لحاظ سے۔

---

[1] اب تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روایت جھوٹی ہے اور عباسیوں کی مخالفت میں بنائی گئی ہے۔
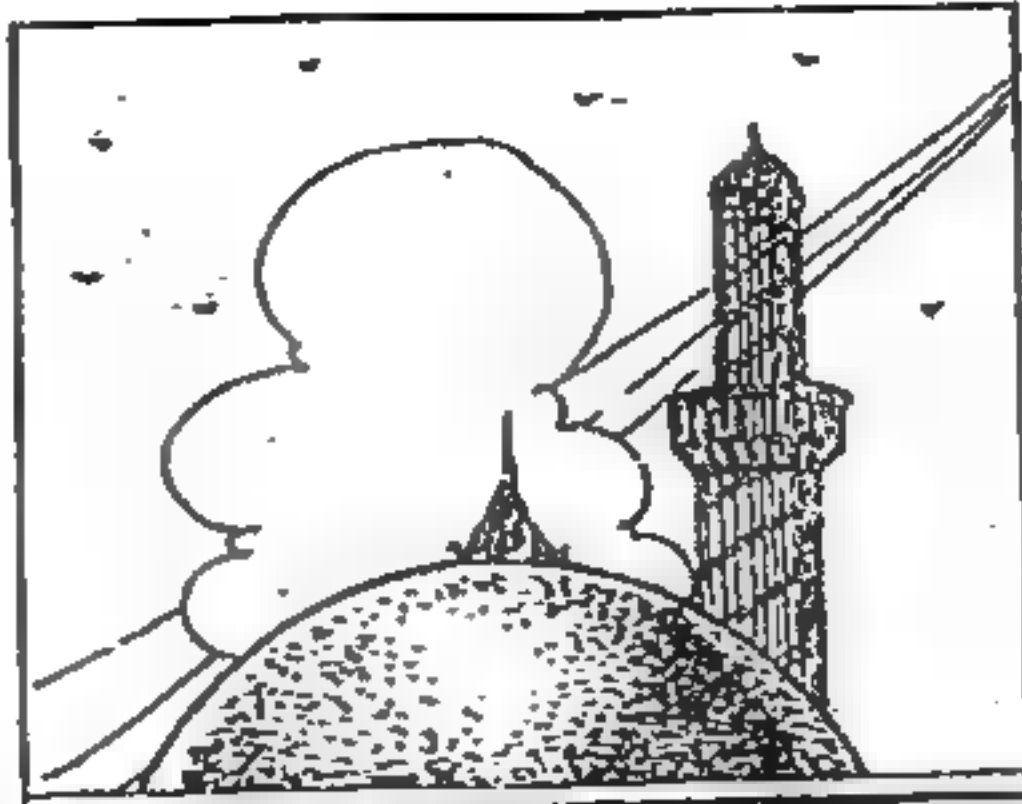
پیدائش بغداد میں پیدا ہوئے۔ اور یہیں عمر بھر قیام کیا اسی رعایت سے بغدادی کہلائے۔ جناب مخدوم علی ہجویریؒ نے آپ کا نام نامی اور اسم گرامی کشف المحجوب میں ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔ شیخ المشائخ اہل طریقت۔ امام الائمہ شریعت۔ ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید بغدادیؒ۔

جناب جنید کی کنیت ابوالقاسم، لقب سید الطائفہ، طاؤس العلماء اور قواریری زُجاج ہے۔ بسیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کے والد محترم آبگینہ فروش تھے۔ اسی رعایت سے آپ کو قواریری زُجاج کے القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

آپ جناب سفیان ثوری کے تلامذہ کے شاگرد اور اپنے ماموں جناب شیخ سری سقطیؒ کے مرید تھے۔ آپ کی عظمت کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کے ماموں سے دریافت کیا کہ کوئی مرید آپ کی نظر میں ایسا بھی ہے جو مرتبہ و مقام میں اپنے مرشد سے بڑھ گیا ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں ہے۔ وہ جنید ہے۔

شیخ ابو جعفر حداد کہتے ہیں کہ اگر عقل بہ شکل انسان ہوتی تو جنید کی صورت میں آتی۔ آپ کے حکیمانہ، صوفیانہ اقوال اہل ایمان کے لیے تقویت کا باعث ہیں۔

جناب جنید بغدادی کے سن ولادت کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ تیسری صدی ہجری میں اس وقت پیدا ہوئے کہ جب اسلامی علوم نقطۂ عروج پر تھے اور مامون الرشید کی مشاغل دینی و علمی سے دلچسپی کی بدولت بغداد میں بڑے بڑے باکمال علماء و فضلا جمع تھے۔

آپ ابھی سات ہی برس کے تھے کہ اپنے ماموں جناب سری سقطی کے ساتھ حج کو گئے۔ جناب سری سقطی کے ساتھ ان کے بہت سے درویش بھی تھے۔ راستے میں ان سے دین کے مسائل پر بات چیت ہوتی۔ آپ کے درویش باری باری اپنی معلومات اور عقل کے مطابق اظہار خیال کرتے ایک روز ان سے شکر کی تعریف پوچھی گئی سب نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق جواب پیش کیا۔ مگر نکتہ کی بات کوئی نہ کہہ سکا۔ سری سقطی نے سب کے بعد آپ سے مخاطب ہو کر کہا۔ بیٹا! تم بتاؤ؟ آپ نے کہا۔ اللہ پاک کی نعمتوں کو پا کر اس کی نافرمانی نہ کرنا، بس یہی شکر ہے۔

جناب جنید بغدادی کی تعلیم و تربیت آپ کے ماموں سری سقطی علیہ الرحمہ ہی کے التفات خصوصی کا نتیجہ ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ فقر و سلوک کے منازل طے کرنے کے ساتھ آپ ایک زبردست عالم دین اور فقیہہ بھی بنیں۔ چنانچہ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ بیس برس ہی کی عمر میں جناب ابو ثور کے حلقے میں بیٹھ کر فتوے لکھنے لگے۔

علوم دین میں تکمیل پالنے کے بعد آپ نے زہد و عبادت اور تسبیح و تقدیس کی طرف بہت زیادہ رغبت کی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دُنیا کے کاروبار میں بھی مصروف رہے۔ شیشہ کی جو آبائی دکان آپ نے ورثے میں پائی تھی۔ اسی میں کاروبار شروع کر لیا اور شیشے کی بجائے ریشمی کپڑوں کے تھان رکھ لیے۔

مگر حُبِ دُنیا کے بارے میں جناب مولانا روم فرماتے ہیں کہ ؎

چلیست دنیا از خدا غافل بُدن

اس سے آپ نے کبھی ایک لمحہ کا تعلق بھی پیدا نہیں کیا وہ ریاضت ومجاہدے بھی کرتے اور دنیا کے کاموں میں بھی مصروف رہتے لیکن ان تمام حدود اور شریعت کو سامنے رکھتے۔ فرمایا کرتے کہ ہمارا یہ مذہب تصوف اصول کتاب وسنّت کا مقید ہے۔ جو شخص قرآن وحدیث اور کتاب وسنّت سے واقف نہیں، پیروی کے لائق نہیں۔

ایک وقت آیا کہ جناب شیخ سری سقطیؒ نے اپنی آرزو کو پورا ہوتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے جناب جنیدؒ کو اتباعِ کتاب وسنّت۔ اور کمال اطاعت کی بدولت روحانیت کے اتنے بڑے بلند مرتبے پر پہنچا دیا کہ خود جناب سری سقطیؒ ایسے کامل ترین بزرگ آپ سے رائے اور صلاح مشورے لینے لگے۔

ایک مرتبہ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا کہ آپ کچھ پریشان سے ہیں۔ پوچھا، ماموں جان خیریت تو ہے۔ فرمایا ہاں خیریت ہے آج ایک نوجوان میرے پاس آیا تھا۔ پوچھتا تھا کہ توبہ کی کیا تعریف ہے؟ آپ نے جواباً عرض کیا توبہ یہ ہے کہ اپنے گناہوں کو بالکل محو کردے۔

بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اوّل اوّل آپ وعظ کہنے ہوتے جھجکتے تھے۔ مگر جب آپ کو خواب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تو ان کے ارشاد پر آپ نے وعظ کہنا شروع کیا۔ اس عرصے میں آپ کے ماموں جناب شیخ سری انتقال کر چکے تھے۔

مگر جناب مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو جناب شیخ سری سقطی کی حیات ہی کے زمانے کا واقعہ لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ لوگوں نے جناب جنید بغدادی سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شیریں نکتہ آفریں زبان عطا فرمائی ہے۔ آپ کا بیان درد اور سوز سے پُر ہوتا ہے۔ آپ وعظ فرمایا کیجیے۔ آپ نے کہا جب تک میرے شیخ و بزرگ ماموں زندہ ہیں۔ ان کی زندگی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] آپ کے پاس ایک درویش آئے

[illegible]

[illegible] جنیدؒ نے فرمایا کہ [illegible]

[illegible] گیا

جناب جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ایک وقت میرے دل میں شیطان کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ ایک روز مسجد کے دروازے پر کھڑا تھا کہ ایک بوڑھا آدمی آتے ہوئے دکھائی دیا۔ جب وہ میرے قریب آیا تو مجھے اس کو دیکھ کر سخت نفرت ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں وہی ہوں جسے تم دیکھنا چاہتے تھے۔ تب میں نے اس سے کہا اے گستاخ تجھے کس بات نے روکا کہ تو آدم کو سجدہ کرے۔ وہ کہنے لگا اے جنیدؒ! تم جیسے موحد کے دل میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کروں؟ مجھے اس کا جواب سن کر کوئی جواب نہ بن پڑا اور بہت حیران ہوا۔ قریب تھا کہ میرا ایمان متزلزل ہو جائے۔ مجھے غیب سے آواز آئی اے جنیدؒ! اس سے کہہ دے کہ تو بالکل جھوٹا ہے اگر تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان اور اس کے اختیارات پر ایمان رکھتا تو کبھی حکم عدولی نہ کرتا۔ پس شیطان نے میرے دل کی آواز سن لی اور میری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

جناب جنید بغدادیؒ کے مزاج میں حلم، تحمل اور بردباری قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ طبیعت میں سنجیدگی، متانت، شفقت آپ کا جوہر خاص تھا۔

یہی سبب ہے کہ آپ علماء اور صوفیا دونوں گروہوں میں نہایت معزز و محترم تھے۔ ہر چند بعض شر پسند طبائع نے آپ سے حسد کیا اور آپ کو تکالیف پہنچانے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید ایزدی ہمیشہ آپ کے ساتھ رہی۔

آپ کے زہد و تقویٰ کو توڑنے کے لیے ایک مرتبہ شر پسندوں نے آپ کے پاس ایک نازنین حور وش پری تمثال عورت کو بھیجا۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور نہایت انکسار و عجز کے ساتھ گڑگڑا کر التدعا کی کہ آپ مجھے اپنی صحبت میں رکھ لیجئے اور اللہ اللہ کرنا سکھا دیجئے۔ آپ اس کی باتوں کو سر جھکائے بغور سنتے رہے اور اس کے بعد اللہ کہہ کر ایک آہ جو کھینچی تو وہ تڑپ کر گر گئی اور گرتے ہی دم نکل گیا۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک بندوں کی آہ اثر سے خالی نہیں جاتی اللہ اپنے بندوں کی ہر طریقے سے مدد کرتا ہے جو اللہ کے بندوں کو ستاتے ہیں۔ اللہ جلد یا بدیر ضرور انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک عورت روتی پیٹتی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ کہ میرا بیٹا کہیں کھو گیا۔ دعا فرمایئے کہ وہ مل جائے۔ آپ نے فرمایا: جا بی بی جا صبر کر۔ عورت چلی گئی مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر حاضر ہوئی اور دعا کے لیئے عرض کیا۔ آپ نے پھر یہی جواب دیا۔ چنانچہ وہ چلی گئی۔ لیکن مامتا کی ماری ایک لمحہ چین سے نہ بیٹھ سکی وہ تیسری مرتبہ پھر حاضر خدمت ہوئی اور عرض کیا کہ اب میرا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا۔ اب مجھ میں صبر کی طاقت نہیں رہی۔ آپ دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اے بی بی! اگر یہی بات ہے تو جا گھر چلی جا سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا بیٹا گھر آ گیا ہے! چنانچہ وہ عورت گھر چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا صحیح آ گیا۔ وہ فوراً اس کو ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

لوگوں نے اس واقعہ پر بڑا تعجب کیا۔ آپ نے جواب میں قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھی: ومن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء فرمایا کہ جب اس عورت میں ضبط کی طاقت نہ رہی تو کیا وجہ تھی کہ اللہ تعالےٰ اس کی نہ سنتا اور دعا قبول نہ کرتا۔

تصوّف کا علمی دور آپ کا زمانہ تیسری ہجری کا علمی دور ہے جس میں تصوّف نے ایک جداگانہ مسلک کی حیثیت پائی۔ آپ ہی کے زمانے میں علم تصوّف پر تالیفات و تصنیفات کا آغاز ہوا۔

تذکرۃ الاولیاء میں خواجہ فریدالدین عطار لکھتے ہیں کہ "کسے کہ علم اشارت منتشر کرد جنید بغدادی بود" یعنی جس شخص نے سب سے پہلے علم اشارہ کی اشاعت کی وہ جنید بغدادی علیہ الرحمہ تھے۔

علم کے بارے میں بھی آپ ہی کے زمانے میں کہا گیا کہ علم کے دو پہلو ہیں ایک ظاہری، دوسرا باطنی۔ ظاہری سے مراد شریعت اور باطنی سے مراد طریقت۔ اسی زمانے میں یہ رائے بھی قائم کی گئی کہ باطنی علوم سب سے پہلے جناب محمد رسول اللہ سے جناب علی کرم اللہ وجہہ نے حاصل کیے۔ پھر ان سے جناب خواجہ حسن بصری نے پھر ان سے دیگر تمام بزرگان دین اسلام یکے بعد دیگرے سینہ بہ سینہ حاصل کرتے چلے آئے۔ اسی مناسبت سے علم تصوّف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ علم سفینہ نہیں بلکہ علم سینہ ہے۔

کہا گیا کہ شریعت سے انسان حقیقت کو پاتا ہے اور طریقت سے اسے معرفتِ حق حاصل ہوتی ہے۔ گویا شریعت، طریقت، حقیقت، و معرفت ہی وہ عناصر چہارگانہ ہیں۔ جو قدیم صوفیائے کرام کے تصوّف کو صوفیائے متاخرین سے علیحدہ کرتے ہیں۔ یہی پہلا مرحلہ ہے جہاں سے عالموں اور صوفیوں کے درمیان ایک مستقل نزاع شروع ہوئی علمائے کرام اور صوفیاء دو علیحدہ گروہ بن گئے۔

سیدالطائفہ جناب جنید بغدادی اس سلسلے کے پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے یہ کہہ کر "شریعت اور طریقت" اسلام کی دو مختلف راہیں نہیں بلکہ ایک ہی تعلیم کے دو پہلو ہیں۔ اس تنازعہ کو ختم کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

تصوّف کے بارے میں آپ فرماتے ہیں۔ ہر بُرے اخلاق سے علیحدہ رہنا اور اچھے اخلاق اختیار کرنا تصوّف ہے۔ تصوّف کا علم کتاب و سنّت سے باہر نہیں جس نے قرآن مجید نہیں پڑھا اور حدیث نہیں لکھی وہ تصوّف میں بات کرنے کا اہل نہیں۔

اہل تصوف کا سب سے بڑا سرمایہ فقر ہے۔ فقر تمام شکلوں سے دل کو خالی کر دینے کا نام ہے۔ وہ اہل فقر سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ اے فقراء تم اللہ تعالیٰ کی معیت ہی سے پہچانے جاتے ہو اور اسی سبب سے تمہاری عزت کی جاتی ہے۔ پس تم جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوت میں ہوتے ہو تو غور کرو کہ تمہارا رشتہ اللہ تعالیٰ سے کتنا مضبوط اور کس قدر استوار ہے۔ صاحب کشف المحجوب اس عبارت کی تشریح فرماتے ہیں کہ جناب جنید بغدادی نے فرمایا اے درویشو! خلق خدا تمہیں درویش کہتی اور تمہارا حق ادا کرتی ہے تمہیں بھی غور کرنا چاہیے کہ تم درویشی کی راہ کے تقاضے کیونکر پورے کرتے ہو۔ اور اگر پورے نہیں کرتے اور خلق خدا تمہیں کسی دوسرے نام سے پکارے تو اس حال میں تمہیں بھی ناراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم بھی اپنے دعوے میں انصاف و راستبازی سے کام نہیں لے رہے۔ وہ شخص جو اپنے دعوے کے خلاف چلے اس کی مثال اس طبیب جیسی ہے جو فن طبابت کے بلند بانگ دعوے کر کے بیماروں کو اپنے پاس بلاتا ہے۔ لیکن فن طبابت سے بالکل ناواقف ہے۔ اس طرح بیماروں کی بیماریاں گھٹنے کی بجائے بڑھتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ خود بیمار پڑ جائے تو اپنا بھی علاج نہ کر سکے اور وہ دوسروں کے پاس جانے پر مجبور ہو۔

قدیم صوفیا کا دور جن بزرگان دین کے نام سے عبارت ہے۔ ان میں سید الطائفہ جناب جنید بغدادی کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ آپ کے علاوہ اس دور کے جن بزرگوں نے بھی شہرت پائی ان میں جناب جنید بغدادی کے خلیفہ اور مرید شیخ ابوبکر شبلی، شیخ ابوعلی ثقفی، شیخ سہیل بن عبداللہ تستری، شیخ علی رودباری، شیخ ابوبکر طمستانی، بایزید بسطامی، ابوبکر شفافت، حسین لوزی، سری سقطی، اسمٰعیل بن نجید، ابوعثمان جری وغیرہ شیوخ عظام کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

اللہ اور اس کے رسولؐ کی مکمل اطاعت و فرماں برداری کرنا، ہاتھ پیر ہلا کر حق حلال کی روزی کمانا، بلا امتیاز و تخصیص تمام لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، ظاہر و باطن ایک ہونا اور اعمال میں اخلاص کا پیدا کرنا صوفیائے قدیم کی نمایاں خصوصیات

تھیں مختصراً یہ کہ تابعین و تبع تابعین کے دور کو قدیم صوفیا کا دور کہا جاتا ہے اور اس زمانے کے بزرگانِ دین علم شریعت میں کامل تبحر کے حامل تھے۔

مگر جن صوفیوں نے تصوف کے نام پر اپنے آپ کو علم و عمل سے بیگانہ کر لیا۔ درحقیقت انہوں نے اولیائے کرام کی سیرت کا مطالعہ نہیں کیا۔ تصوف کے بارے میں صوفیائے کرام کے ایک بزرگ۔

ابوبکر طمستانی کہتے ہیں: راستہ کھلا ہوا ہے اور کتاب و سنت ہمارے سامنے موجود ہے۔

بایزید بسطامی کہتے ہیں، اگر کسی شخص کو دیکھو کہ اسے اتنی کرامتیں دی گئی ہیں کہ وہ ہوا میں اڑتا ہے تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ۔ یہاں تک کہ دیکھ لو کہ وہ امر و نہی اور حدود شریعت میں کیسا ہے۔

ابوبکر شفاف کہتے ہیں، جس نے ظاہر و امر و نہی کے حدود کا لحاظ نہیں رکھا وہ دل کے مشاہدۂ باطنی سے محروم رہا۔

حسین نوری کہتے ہیں: اگر ایک شخص کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی حالت کا دعوی کرتا ہے جو اسے علم شریعت کی حد سے نکال دیتی ہے تو اس کے قریب نہ جاؤ۔ اور اگر ایک شخص کو دیکھو کہ وہ ایک ایسی حالت کا دعوی کرتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ اور ظاہری احکام کی پابندی اس کی شہادت نہیں دیتی تو اس کے دین پر تہمت لگاؤ۔

سری سقطی کہتے ہیں جس شخص نے ایسی باطنی حقیقت کا دعوی کیا جس کی تردید شریعت کے ظاہری حکم سے ہوتی ہے اس نے غلطی کی۔

اسمٰعیل بجید کہتے ہیں۔ امر و نہی پر صبر کرنا تصوف ہے۔

جناب جنید جو مرض الموت میں بھی تکیہ پر منہ رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے کیونکہ ان کے منہ پر ورم تھا کسی نے ان سے پوچھا کہ کیا ایسی حالت میں بھی نماز نہیں چھوڑی جا سکتی۔ آپ نے فرمایا، نماز ہی کے ذریعے سے خدا تک پہنچا ہوں اس لیے میں اسے

چھوڑ نہیں سکتا اور اس کے چند گھنٹے بعد آپ مالک حقیقی کے پاس چلے گئے۔ آپ نے دار الفنا سے دار البقا کی طرف ۲۹۸ھ میں کوچ کیا۔

فرید الدین عطار نے تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ اگرچہ تصوف کی عام اشاعت جناب جنید بغدادی ہی سے ہوئی ہے۔ لیکن ان کا لباس (پشمینہ) صوفیاء کی بجائے عالموں کا تھا۔ جناب مخدوم علی ہجویری کشف المحجوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ جناب جنید بغدادی کے نزدیک تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے۔

اوّل، سخاوت (جناب ابراہیم علیہ السّلام کی) دوم، رضا (جناب اسمٰعیل علیہ السّلام کی) سوم، صبر (جناب ایوب علیہ السلام کا) چہارم، اشارہ (جناب زکریا علیہ السلام کا) پنجم، غربت (جناب یحییٰ علیہ السلام کی) ششم، سیاحت، (جناب عیسیٰ علیہ السّلام کی) ہفتم، اون کا لباس (جناب موسیٰ علیہ السّلام کا) ہشتم فقر (جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا) یعنی آٹھ خصلتیں جن سے ان پیغمبران اولوالعزم کی سنّت پوری ہوتی ہے، تصوف کی بنیاد ہیں۔

شطحیات ایسے الفاظ و کلمات جو بعض اوقات حدود شریعت سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں شطحیات کہلاتے ہیں۔ جناب جنید بغدادی کے زمانے میں "شطحیات" عام تھے۔ مگر آپ نے ان کلمات کے ادا کرنے والوں کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ لکھا ہے ایک مرتبہ آپ کی خانقاہ میں ایک فقیر کالی گدڑی پہنے ہوئے آیا۔ آپ نے اس کی ماتم داری و سیاہ پوشی کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا میرے خدا کی وفات ہو گئی۔ اس پر آپ نے اسے تین مرتبہ خانقاہ سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ لیکن فقیر نے اس کی تعمیل نہ کی۔ چوتھی مرتبہ جب اس سے پھر کہا گیا تب اس نے اپنے کلام کی اس طرح توضیح و تشریح کر کے جناب جنید کے غیظ و غضب سے رہائی پائی۔ کہ میرا نفس مظہر خدا ہے میں نے اُسے قتل کر دیا ہے (یعنی نفس کشی کی) اس لیے اب اس کا ماتم دار ہوں۔

منصور حلاج کے نعرہ "انا الحق" کا قصہ آپ کے زمانے کا سب سے زیادہ مشہور

واقعہ ہے۔ مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں یہ عین ممکن ہے کہ علامہ جوزی کی یہ رائے غلط نہیں کہ منصور نے سیدھے راستے کو چھوڑ کر گمراہی کی راہ اختیار کی اور بالآخر جناب جنید بغدادی ہی کو منصور کے قتل کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کرنی پڑی۔

منصور حلاج حسین بن منصور حلاج کے والد ایک نومسلم ایرانی تھے، جو بیضا نامی ایران کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے یہیں اس حسین کی ولادت ہوئی جس نے منصور حلاج کے نام سے شہرت پائی۔ منصور کے والد کسی وجہ سے جلد ہی بیضا سے نکل کر عراق میں آکر آباد ہوگئے وہیں منصور نے ہوش سنبھالا۔

خواجہ فریدالدین عطار نے منصور کو قتیل اللہ فی سبیل اللہ اور شیر بیشۂ تحقیق جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔ لیکن آگے چل کر تذکرہ اولیاء میں خود توضیح بھی کی کہ بعض مشہور اولیائے کرام منصور کی بزرگی کو تسلیم نہیں کرتے۔

علامہ جوزی نے تلبیس ابلیس میں منصور کے خیالات و عقائد تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ منصور سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا انسان تھا۔ یا اس نے تشبیہ و استعارات کی پُرپیچ وادیوں میں خود کو گم کر دیا تھا۔ علامہ جوزی نے منصور کے حالات تلبیس ابلیس میں تفصیل سے لکھے ہیں ان کے نزدیک اس کے تحصیل علم کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب وہ سن بلوغت کو پہنچا، عراق چھوڑ کر شوستر چلا گیا، وہاں سہیل بن عبداللہ کی شاگردی اختیار کی۔ اٹھارہ برس کی عمر تک۔"

اس کے علاوہ اسے ابوالحسین ثوری اور جنید بغدادی ایسے اولیائے کرام صحبت بھی میسّر آئی۔ برسوں ان کی خدمت میں جاتا رہا۔ پھر بغداد سے بصرے چلا گیا اور عمر بن عثمان کی صحبت اختیار کی۔ اب تک اس کے خیالات عام سیدھے سادے مسلمانوں کی طرح تھے۔ لیکن پھر اس کے خیالات بدلنے لگے۔ اور ذہن طرح طرح کی نئی تاویلات و تعبیرات کی طرف پھر گیا۔ اس کا سبب ان کتابوں کو دیکھنا تھا، جنھیں تصوّف کے موضوع پر عمر بن عثمان نے لکھا تھا۔ اور پھر وہ اس حال کو پہنچ گیا کہ تصوّف کی وہ باتیں جنھیں بڑے بڑے صوفیائے کرام بھی لب پر لانے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ یہ انھیں برملا

کہنے لگا جس سے لوگ نہ صرف اس سے بیزار ہو گئے، بلکہ عمرو بن عثمان سے بھی نفرت کرنے لگے۔

ایک روز منصور نے جناب جنید سے بھی وہی چند ایک الٹے سیدھے سوال کیے کہ جن کے بارے میں عام لوگوں کو شکایت تھی۔ جناب جنید نے فرمایا وہ وقت قریب ہے کہ جب لکڑی کا ایک سرا تیرے خون سے لال ہوگا۔

منصور آپ کی تنبیہ کے بعد بغداد سے پھر شوستر آگیا۔ رنگ طبیعت میں کسی قدر تبدیلی آگئی اور مزاج میں ایک عالمانہ و فاضلانہ شان پیدا ہوگئی لوگ عزت و احترام کرنے لگے لیکن اس حال میں ابھی تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ پھر وہی خیالات عود کر آئے اور اپنی پہلے والی باتوں پر پھر آگیا۔

وہ تصوف کے نام سے ایسی ایسی باتیں کہتا اور گل افشانیاں کرتا تھا کہ جاہل تو ایک طرف، خود عالموں کے پلّے بھی نہیں پڑتی تھیں ان میں سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے انا الحق (میں حق ہوں) کا نعرہ شروع کیا، وہ کہتا تھا۔

> ترجمہ: "میں وہی ہوں جسے میں چاہتا ہوں اور جسے میں چاہتا ہوں وہ میں ہی ہوں۔ ہم دونوں روحیں ہیں جنھوں نے ایک قالب میں حلول کیا ہے۔ اسی لیے جب تم مجھے دیکھتے ہو تو اسے دیکھتے ہو۔ جب اسے دیکھتے ہو تو ہمیں دیکھتے ہو۔"

آخر لوگ علمائے اسلام کے پاس جا جا کر شکایتیں کرنے لگے۔ علمائے کرام سے پوچھا کہ اس کا کیا علاج کرنا چاہیے۔ اگرچہ علماء و صوفیاء سب نے مل کر سمجھایا کہ یہ کلمات کفر ہیں ان سے زبان کو روکے مگر اس نے کسی کی نہ مانی۔ انجام کار یہ کہ سب کو منصور کے خلاف سزائے قتل کا فیصلہ کرنا پڑا۔

منصور کے خیالات سے لوگوں میں اس کے خلاف جو فتنہ پیدا ہوئی ذیل کے واقعات سے اس کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔

عمرو مکی کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ حسین بن منصور مکہ کی ایک گلی میں جا رہے تھے اور

میں ان کے ہمراہ قرآن پڑھتا جا رہا تھا۔ میری قرأت سن کر بولے کہ ایسا کلام میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ یہ بات سنتے ہی میں ان سے علیحدہ ہو گیا۔

محمد بن یحییٰ رازی کہتے ہیں کہ میں نے عمرو بن عثمان کو حلاج پر لعنت کرتے ہوئے سنا اور کہتے تھے کہ اگر میں نے حلاج پر قابو پایا تو اسے اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔ میں نے پوچھا اس کا سبب؟ کہا میں نے قرآن کی ایک آیت پڑھی تو کہنے لگا ممکن ہے ایسا کلام میں بھی تالیف کر لوں۔

ابو بکر بن ممشاد نے کہا کہ دینور میں ہمارے پاس ایک آدمی آیا اس کے پاس ایک تھیلی تھی جسے وہ دن رات اپنے پاس رکھتا اور کبھی جُدا نہ ہونے دیتا تھا۔ لوگوں نے اس کی تھیلی کو ٹٹولا تو اس میں حلاج کا ایک خط نکلا، جس کا عنوان یہ تھا کہ رحمان و رحیم کی طرف سے فلاں بن فلاں کو واضح ہو کہ، وہ خط بغداد بھیجا گیا۔ حلاج کو بلا کر وہ خط پیش کیا گیا۔ کہا کہ یہ خط میرا ہے اور میں نے لکھا ہے۔

لوگوں نے کہا پہلے تو صرف تم نبوّت کا دعویٰ کرتے تھے۔ اب الوہیت کا بھی دعویٰ کرنے لگے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کے قتل کا فیصلہ جناب سید الطائفہ جنید بغدادی ہی نے صادر فرمایا۔ لیکن بعضوں نے اس سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ قتل حلاج کے زمانے میں آپ حیات نہیں تھے آپ سے اس واقعہ کا منسوب کرنا شرارت ہے۔

اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے اس معاملہ پر جریری شبلی اور ابن عطار سے پوچھا گیا۔ جریری نے کہا، یہ شخص کافر ہے اور واجب القتل ہے شبلی نے کہا۔ جو شخص ایسا کہے اسے نظر بند کیا جائے۔ ابن عطار سے پوچھا تو انہوں نے حلاج ہی کے طرز پر جواب دیا۔ یہی ان کے قتل کا سبب ہوا۔

شیخ ابو عبد اللہ خفیف سے عیسیٰ بن فورک نے ان اشعار کا مطلب دریافت کیا۔

ترجمہ:۔ "پاک ہے وہ ذات جس نے عالم ناسوت کو لاہوت درخشاں کی روشنی کے راز کا مظہر بنایا۔ پھر اپنی مخلوق میں کھلم کھلا کھانے پینے والے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہاں تک کہ اس کی مخلوق نے اسے اس طرح سے دیکھا جیسے دونوں بھنویں مقابلے میں

دکھائی دیتی ہیں۔ شیخ نے یہ اشعار سن کر کہا ایسے شخص پر خدا کی لعنت جس کا یہ کلام ہے فورک نے کہا یہ اشعار منصور بن حسین حلاج کے ہیں تو وہ کافر ہیں۔"

ابوالقاسم اسمٰعیل بن زنجی نے اپنے باپ سے روایت کی کہ بنت سمری حامد وزیر کے پاس بھیجی گئی۔ حامد نے اس سے حلاج کے متعلق سوال کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میرے والد مجھے اس کے پاس لے گئے اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے تیری شادی اپنے بیٹے میلان سے کر دی جو نیشاپور میں رہتا ہے جب میری اور تمہاری مرضی کے خلاف ہو تو تم دن کو روزہ رکھنا اور شام کو کوٹھے پر چڑھنا اور بغیر پسے ہوئے نمک سے روزہ کھولنا اور منہ میری طرف کرنا۔ اور جو بات تمہیں ناگوار گزرے مجھے یاد دلانا میں ہر بات کو سنتا اور دیکھتا ہوں۔ بنت سمری نے کہا کہ ایک دن میں کوٹھے پر سو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ حلاج مجھ سے آ لپٹے۔ میں ان کی اس حرکت سے خوف کے مارے کانپنے لگی اور جاگ اٹھی۔ حلاج نے کہا میں تمہیں صرف نماز کے لیے جگانے آیا تھا۔ جب ہم کوٹھے سے نیچے اترے تو حلاج کی بیٹی نے مجھ سے کہا انہیں سجدہ کرو میں نے کہا کہیں کوئی غیر اللہ کو بھی سجدہ کرتا ہے اس پر حلاج نے کہا۔ ہاں ایک خدا آسمان پر ہے اور ایک زمین پر۔

حلاج کے زمانے کے جن علما نے اسے واجب القتل قرار دیا ان میں ابوعمر قاضی کا نام سرفہرست ہے۔ پھر تمام علما نے ان کی رائے سے اتفاق کیا فقط ابوالعباس شریح نے خاموشی اختیار کی اور کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حلاج کیا کہتا ہے۔ ابوبکر محمدؒ بن داؤد اصفہانی نے کہا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ پر نازل کیا ہے اگر وہ حق ہے تو جو کچھ حلاج کہتا ہے وہ باطل ہے۔ علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ جنید بغدادی کے خلیفہ و مرید ابوبکر شبلی نے شدت کے ساتھ حلاج کی مخالفت کی ہے۔

کہتے ہیں خلیفہ بغداد نے باوجود قتل کا فیصلہ ہو جانے کے منصور کو اتمام حجت کے لیے ایک سال زنداں میں رکھا۔ خلیفہ مقتدر باللہ عباسی نے آخری فیصلے کے لیے جناب جنید بغدادی کے فتوے کا انتظار کیا۔ بالآخر آپ کو بھی یہی فیصلہ کرنا پڑا اور اس پر مہر

تصدیق ثبت کرنی پڑی کہ جو صورت ہے اس کے اعتبار سے تو واجب القتل ہے۔ رہا باطن تو باطن کا حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

ممکن ہے کہ جناب جنید نے ایک فقیہہ کی حیثیت سے ضرور یہ فتویٰ دیا ہو مگر جب تکمیل کا زمانہ پہنچا آپ اس وقت حیات نہیں تھے۔ منصور کو ۳۰۹ھ میں سولی پر لٹکایا گیا۔ پھر اس کی لاش سولی سے اتار کر جلائی گئی اور اسے دریا میں بہا دیا گیا واللہ اعلم بالصواب! عقوبت کا یہ واقعہ صحیح ہے کہ غلط؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ سزا کا واقعہ ضرور صحیح ہے۔

سفینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ نے اس سے نہ صرف انکار کیا ہے کہ جناب جنید بغدادی نے منصور کے قتل کا فتویٰ دیا بلکہ اسے ایک شرارت قرار دیا ہے جو حضرت جنید کے خلاف علماء اسلام کی طرف سے کی گئی لکھا ہے کہ قتل منصور کا واقعہ حضرت جنید کے انتقال کے گیارہ بارہ سال بعد ہوا ہے۔

سفینۃ الاولیاء میں جناب جنید بغدادی کی تاریخ وفات ۲۹۷ ہجری لکھی ہے اور بیان کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ ۲۶۹ ہجری میں ہوئی لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ منصور حلاج کے واقعہ قتل کی تاریخ ۲۵ ذالحجہ ۳۰۹ ہجری بیان کی گئی۔

اب اس بیان کی روشنی میں یہ صاف معلوم ہو گیا کہ جن علمائے اسلام و صوفیائے عظام اور اولیائے کرام نے منصور کو پسند نہیں کیا ان کا ناپسند کرنا محض ان کے ذاتی خیالات و معتقدات کا نتیجہ نہیں تھا۔

علامہ جوزی نے لکھا ہے کہ اصل میں تصوف جدیدہ میں ایک گروہ ایسا بھی ملتا ہے جس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا ہی میں ہو جاتا ہے وہ لوگ کہتے ہیں کہ ممکن ہے شہر کے گلی کوچے میں کوئی خدا ہو۔

انہی کے ایک گروہ نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ خدا ان کے پاس آتا ہے اور وہ خدا کے پاس جاتے ہیں۔ عراق میں یہ گروہ اصحاب الناس اصحاب الوساوس اور اصحاب الخطرات کہلاتا ہے کچھ ایسے ہی لوگ ہندوستان میں بھی موجود ہیں جن کا تصوف اسلامی سے

دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مگر صوفی ہونے کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں۔ الغرض یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے منصور حلاّج کو شیر بیشہ تحقیق کے نام سے یاد کیا ہے اس کی حمایت کی ہے اور اس کے رمز و کنائے کو باطنی علم کہا ہے۔

منصور ہمہ وقت ایک استغراق کی حالت میں رہتا تھا اور کہتے ہیں اسی عالم میں اس سے خوارق عادات و کرامات ظہور میں آئیں جن میں ایک یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز وہ اپنے حلاج دوست کے پاس گیا اور عالم استغراق میں انگلی کے ایک اشارے سے روئی دھننے لگا حلاّج روئی دھننے والے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ سے وہ حسین بن منصور حلاّج مشہور ہو گیا۔

منصور کے بارے میں جناب مخدوم علی ہجویری اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں فرماتے ہیں کہ منصور حلاج طریقت کے اہل حال اور مستوں میں سے ہیں۔ مشایخ ان کے احوال کی ماہیت کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں بعض کے نزدیک منصور حلاج کا طریقہ مردود ہے اور بعض کے نزدیک مقبول جس گروہ نے منصور حلاج کو پسند نہیں کیا ان میں سے عمرو بن عثمان مکی ابو یعقوب نہر جوری ابو یعقوب اقطع اور علی بن اصفہانی اہم ہیں اور جس گروہ نے حلاج کے طریقے کو پسند کیا ہے ان میں سے ابن عطا محمد بن حنیف ابو القاسم نصر آبادی وغیرہم ہیں۔ اور جن بزرگوں نے حلاج کے بارے میں خاموشی اختیار کی اور توقف کیا ان میں سے جنید بغدادی۔ شبلی جریری اور حصری ہیں ایک گروہ نے منصور کو جادو سحر اور اس کے اسباب و عوامل سے منسوب کیا ہے لیکن ہمارے زمانے میں شیخ المشایخ ابو سعید ابو الخیر۔ شیخ ابو القاسم گرگانی اور شیخ ابو العباس شفانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو راز میں رکھا ہے مگر ہم اس معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ ہمیں اس کی ولایت سے جتنے علامات و دلائل نظر آتے ہیں انہیں سامنے رکھتے ہوئے انہیں بزرگ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے میں نے منصور کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے جن مشایخ نے منصور کو پسند نہیں کیا۔ ان کا رد کرنا ان کی بے دینی کے سبب نہیں ہوتا بلکہ منصور کی عجیب و غریب کیفیت حال کے باعث ہے جس کا سمجھنا ان کی سمجھ سے باہر ہے

منصور ابتداء میں سہیل بن عبداللہ کا مرید تھا۔ پھر ان کی اجازت کے بغیر عمرو بن عثمان مکی کی خدمت میں چلا گیا اور ان کا مرید ہو گیا پھر وہاں سے بھی اجازت لیے بغیر چلا گیا اور جناب بغدادی سے تعلق پیدا کرنا چاہا مگر انہوں نے اسے اپنی صحبت میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ درحقیقت منصور غیر معمولی مستی کے معیار کو تلاش کرتا پھرتا تھا جو اسے ابھی میسر نہیں آیا تھا۔ پس علما نے اسے محض معاملات ظاہری و رسمی کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ مخدوم علی ہجویری فرماتے ہیں۔

مجھ علی بن عثمان جلابی کے دل میں جناب منصور کی بڑی محبت تھی لیکن ان کے مسلک کی چونکہ کوئی بنیاد نہیں اور نہ ان کا حال کسی محل پر قرار پذیر ہے۔ اس لیے میرے نزدیک منصور کا کلام عملی طور پر قطعی پیروی کے لائق نہیں۔

جناب مخدوم علی ہجویری نے اپنے بیان میں حلاج پر جو تنقید کی ہے اس کی رو سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جناب ابوبکر شبلی نے باوجود پُر جلال طبیعت پانے کے منصور سے تعرض نہیں کیا لیکن بعض ثقہ بزرگوں نے اس واقعہ پر جناب ابوبکر شبلی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ منصور کی مخالفت میں آپ نے بڑی شدت اختیار کی۔

جناب سید مخدوم علی ہجویری نے کشف المحجوب میں جناب شبلی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ شبلی نے منصور کے بارے میں فرمایا "میں اور حلاج دونوں ایک ہی حالت میں ہیں۔ میں نے تو جنون سے اپنی جان بچالی مگر حلاج نے عقل سے اپنی جان گنوا لی"
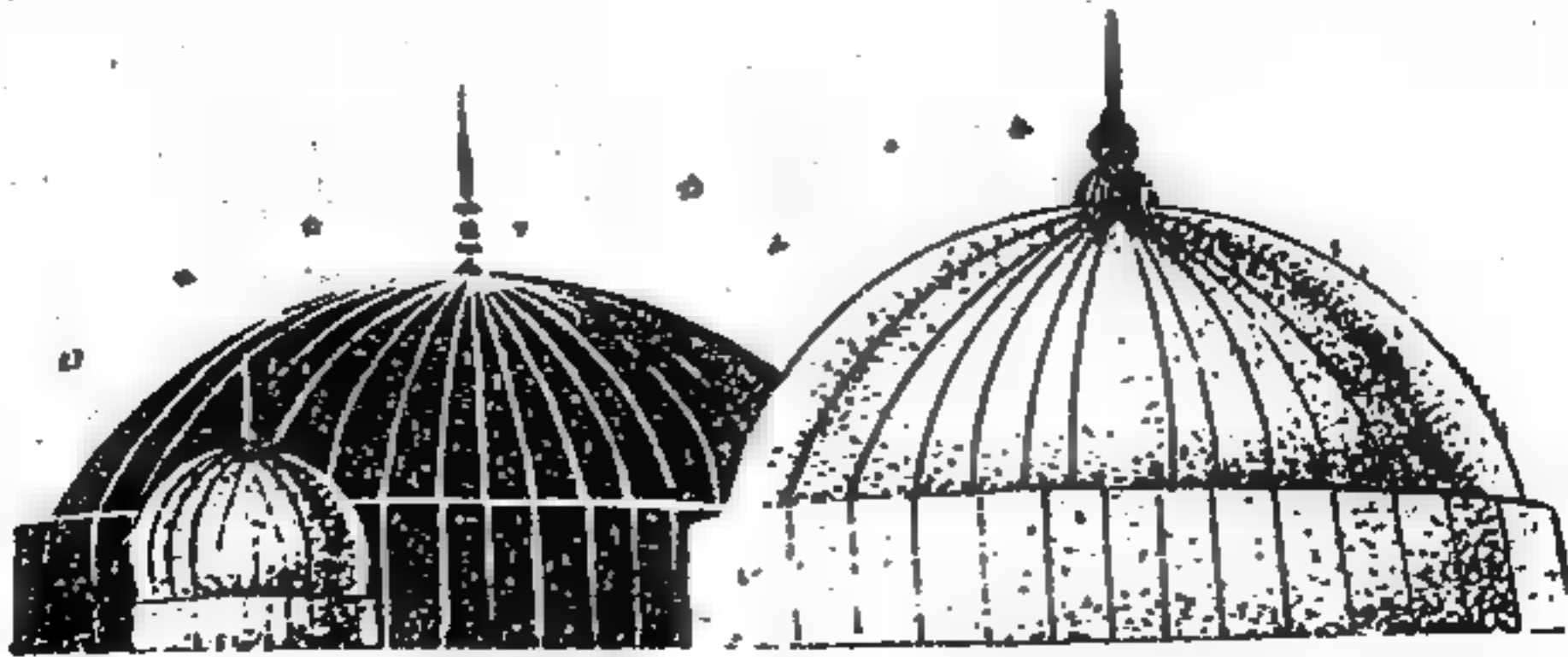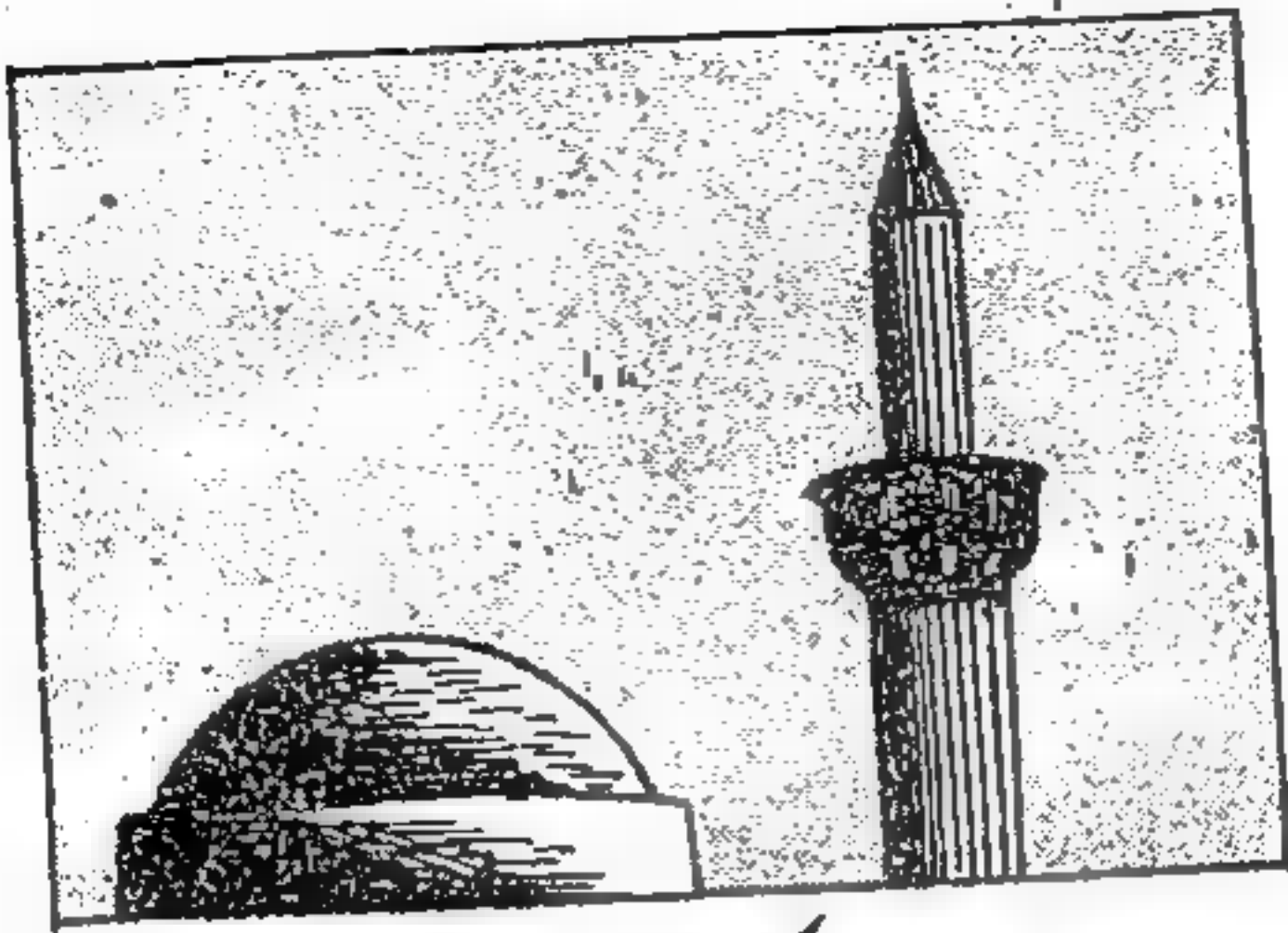
حضرت ابوبکر شبلیؒ

ابوبکر بن دلف احجد رشبلی بعضوں نے جعفر بن یونس لکھا ہے ولادت ۲۴۷ ہجری سامرہ علاقہ عراق میں پیدا ہوئے اور شبلہ میں پرورش پائی اسی مناسبت سے آپ شبلی کہلاتے ہیں۔
شبلہ ایک گاؤں کا نام ہے جو سمرقند سے آگے اسروشنہ کے اطراف میں واقع تھا آپ کے خاندان کے افراد کسی زمانے میں عراق سے نکل کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

آپ نسلاً مصری تھے کہ ترکی اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ کسی نے آپ کو ترکی الاصل سمجھا ہے کسی نے خراسانی لکھا ہے اور کسی کے نزدیک آپ مصری تھے۔

آپ کے والد ایک صاحب اثر و ثروت سردار تھے آپ کے خاندان میں چونکہ دنیاوی وجاہت کے سوا کوئی علمی فضیلت نہیں تھی، اس لیے آپ کی تعلیم کے بارے میں کچھ ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں پائی اور کن کن بزرگوں سے اکتساب علم کیا۔ البتہ اتنا ضرور علم ہے کہ آپ کا خاندان فقہ مالکی پر عمل کرتا تھا اور آپ نے بیس برس تک فقہ پڑھی۔ موطا امام مالک آپ کو زبانی یاد تھی۔

شبلی نے تعلیم سے فراغت پا کر شاہی ملازمت اختیار کر لی اور اپنے خاندان کی

فوجی خدمات کے صلے میں نہاوند کے گورنر بنائے گئے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ عباسی خلیفہ المعتضد باللہ کے جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں تمام بغداد نئی نویلی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا تمام ملکوں کے گورنر خلیفہ کے سامنے باادب ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ سوئے اتفاق سے ایک گورنر کو چھینک آگئی اور ناک سے رطوبت بہنے لگی۔ کوئی رومال پاس نہیں تھا خلعت سے ناپاک کرلی خلیفہ نے گورنر کی اس حرکت دیکھ لیا۔ فوراً عتاب ہوا۔ گورنری جاتی رہی۔ خلعت چھین کر سخت بے عزت کرکے دربار سے نکال دیا گیا۔

شبلی نے اس معاملے کو دیکھ کر اپنے دل میں خیال کیا کہ جس شخص نے شاہی آداب کو ملحوظ خاطر نہ رکھا۔ شاہی خلعت کی توقیر نہ کی اس کا تو یہ انجام ہوا مگر جو شخص حاکم الحاکمین کی خلعت کا احترام نہ کرے اور آداب خداوندی اس کے پیش نظر نہ ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس واقعہ نے آپ کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ گورنری کو لات مار کر فقیر ہو گئے۔ مگر لوگوں کے در کے نہیں۔ اللہ کے گھر کے۔ اللہ کی محبت کے دیوانے بن گئے اب شبلی کی حالت یہ تھی کہ جس شخص کے منہ سے اللہ کا لفظ نکل جاتا اس کا منہ اشرفیوں سے بھر دیتے پھر ایک وقت ان کی مجذوبیت کا ایسا آیا کہ ننگی تلوار لیے پھرا کرتے اور کہتے جو شخص خدا کا نام زبان پر لائے گا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ تمام لوگوں کو ان سے خوف آتا تھا مگر ہمت کر کے ایک دن ایک شخص نے پوچھ ہی لیا۔ کہ آپ اللہ کا نام لینے والوں کو قتل کرنے کے کیوں درپے ہیں؟ فرمایا لوگ عادت پڑ جانے کے سبب اللہ کہتے ہیں ورنہ ان کے دلوں میں ارادہ اور خلوص نہیں رہا۔

ایک روز اللہ سے دعا کی اے پروردگار مجھے دو عالم عطا کر دے تاکہ میں ان کو نوالہ بنا کر یہودی کے منہ میں رکھ دوں مجھے تیری محبت کے سوا کچھ نہیں چاہیئے۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ فقیری اختیار کرنے کے بعد جب آپ کسی صاحب نظر کی تلاش کرتے ہوئے جناب جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچے تو بغدادی علیہ الرحمۃ نے آپ کو اپنی صحبت میں اس شرط پر لینا قبول کیا کہ آپ شدید سے شدید مجاہدے، ریاضتیں کریں گے اور ان سے مطلق نہیں گھبرائیں گے۔

کہتے ہیں جناب جنید بغدادی نے آپ کے مزاج سے گورنری کی بو باس نکالنے اور طبیعت میں عجز و انکسار پیدا کرنے کے لیے آپ کو بھیک مانگنے پر مقرر کیا۔

چنانچہ آپ روزانہ بھیک مانگنے جاتے اور جو کچھ لوگوں سے میسر آتا اسے لے کر فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتے مگر خود بھوکے رہتے۔ لکھا ہے کہ بھیک مانگنے میں آپ کو بڑی دشواری پیش آئی۔ لوگ سمجھتے کہ آپ محتاج و بے کس نہیں ہیں۔ اس لیے کچھ نہ دیتے مگر پھر بھی جوں توں کر کے مرشد کی تکمیل میں آپ کو کچھ نہ کچھ لانا ہی پڑتا تھا۔

ایک روز آپ سے جناب جنید سے پوچھا۔ شبلی کہو اب تمہارے نفس کا کیا مرتبہ ہے؟ عرض کیا اب اپنے آپ کو تمام لوگوں سے ادنیٰ درجہ پر پاتا ہوں۔

اگرچہ معلوم نہیں یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ آپ کی بے نفسی و بے پروائی کے بارے میں مطلقاً کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

شبلی نے اپنے مرشد کی وفات کے بعد ۳۳۴ ہجری میں وفات پائی۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار کا گنبد و محراب

حضرت مخدوم علی ہجویری رح

پیدائش ۴۰۰ ہجری میں غزنی میں پیدا ہوئے آپ کے والد محترم کا اسم گرامی عثمان اور آپ کا نام نامی علی ہے آپ کے گھر کے لوگ پہلے غزنی کے ایک قصبے ہجویر میں رہتے تھے پھر ہجویر کے قریب ہی ایک اور قصبے جلاب میں آ گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی چنانچہ آپ اسی مناسبت سے ہجویری و جلابی کہلاتے ہیں۔

آپ نجیب الطرفین حسنی سید ہیں نسب نامہ یوں ہے۔ علی بن عثمان علی بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی الحسن بن حسن بن زیاد بن جناب امام شہید حسن بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ، گویا نو واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔

فقہی مسلک کے اعتبار سے آپ حنفی تھے آپ کو جناب امام اعظم ابو حنیفہ سے بہت محبت تھی مسلک طریقت کے لحاظ سے آپ سید الطائفہ جنید بغدادی کے پیرو تھے۔

آپ کے مرشد جناب خواجہ ابو الفضل ختلی غزنوی سلسلہ جنیدیہ کے بزرگ تھے جناب ختلی حضرت علی حصر مکی کے مرید تھے، مکی جناب شیخ شبلی کے مرید تھے۔ شبلی سید الطائفہ جنید بغدادی کے مرید تھے جنید بغدادی جناب شیخ سری سقطی کے مرید تھے۔ سقطی جناب شیخ معروف کرخی

کے مرید تھے۔ کرخی جناب شیخ داؤد طائی کے مرید تھے۔ طائی جناب حبیب عجمی کے مرید تھے۔ عجمی جناب خواجہ حسن بصری کے اور خواجہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے مرید و شاگرد تھے۔ گویا اس لحاظ سے آپ کو جناب علی کرم اللہ وجہٗ سے دوہری مناسبت ہے۔

آپ کی تعلیم کے متعلق کچھ تفصیل سے معلوم نہیں کہ آپ نے کن کن بزرگوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا البتہ آپ کی تصنیفات کے مطالعہ سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ علوم دین، فقہ، تفسیر و حدیث میں تبحر کامل رکھتے تھے۔

کہتے ہیں شیخ بزرگ نام ایک ولی سے آپ کی ملاقات ہوئی اس وقت مشکل سے آپ کی عمر بارہ سال کی ہوگی۔ شیخ بزرگ نے آپ سے علم تصوف پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی جب ان کا اصرار بہت بڑھ گیا تو آپ نے اپنی لکھی ہوئی کتاب لاکر ان کی خدمت میں پیش کی اور طالب دعا ہوئے۔

شیخ بزرگ نے فرمایا۔ اے علی مستقبل میں تمہارا نام مطلع تصوف پر سورج کی طرح چمکے گا چنانچہ ان کی یہ پیشگوئی حرف بحرف صحیح نکلی۔

جناب ہجویری نے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے لیے شام، عراق، بغداد، پارس کرمان، خراسان، ماوراالنہر اور ترکستان کا سفر کیا وہاں کے علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے لکھا ہے کہ جن بزرگوں سے آپ نے اکتساب کیا ان کی تعداد تین سو سے اوپر ہے۔ مگر جن دو ایک بزرگوں کی روح پرور صحبتوں سے آپ نے بالخصوص فائدہ اٹھایا ان کا ذکر آپ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں کیا ہے ان میں سے ایک جناب ابوالقاسم قشیری دوسرے جناب ابوالقاسم گرگانی اور تیسرے جناب شیخ ابوسعید ابوالخیر کی ذات گرامی ہے۔

آپ تکمیل علوم ظاہری و باطنی کے بعد ۴۳۱ھ میں لاہور تشریف لائے یہاں آپ نے علوم دین اور اشاعت اسلامی کا ایک ایسا چشمۂ فیض جاری کیا۔ جس سے چھوٹے بڑے ادنیٰ و اعلیٰ سبھی سیراب و فیضیاب ہوئے۔

ورود لاہور لاہور میں آپ کی آمد سے پہلے پنجاب کی سیاسی حالت کیا تھی؟ اس

سے متعلق جاننے کے لیے ہمیں امیر سبکتگین شاہ غزنی کی فتوحات کے سلسلے پر ایک نظر ڈالنی ہوگی جس کا مقصد بظاہر ہندوستان کو فتح کر کے سلطنت غزنہ کی توسیع دکھائی دیتا ہے لیکن بباطن وہ شوق جہاد تھا جسے دل میں لے کر سبکتگین بار بار یہاں آتا تھا۔

۳۶۷ھ ہجری میں سبکتگین جب اہل ہند سے جہاد کرنے کے لیے جان نثاران اسلام کو لے کر نکلا اس نے ہندوستان کے متعدد قلعے اور ملحقہ علاقے فتح کر لیے تو جے پال کو سخت فکر دامنگیر ہوئی چنانچہ اب اس نے اپنی پوری قوت کے ساتھ امیر سبکتگین سے لڑنے کی ٹھان لی۔ ادھر جب امیر کو اس برہمن زادے کے ارادے کا علم ہوا تو وہ بھی ایک لشکر جرار لے کر پشاور کو چل پڑا۔

لمغان جو کابل اور پشاور کے درمیان واقع تھا۔ اس کے میدان میں دونوں لشکر صف آرا ہوئے گھمسان کا رن پڑا۔ سبکتگین کا لڑکا سلطان محمود غزنوی بھی اس لڑائی میں اپنے باپ کے ساتھ شریک تھا اس نے باوجود نہایت کم سن ہونے کے تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔

اب راجہ جے پال نے امیر سبکتگین کے حضور میں صلح کی درخواست پیش کی ہر چند سلطان محمود غزنوی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ راجہ دھوکہ دے رہا ہے تاہم امیر سبکتگین ایک مسلمان بادشاہ کی حیثیت سے رضامند ہو گیا۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ جے پال ایک لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی نذرانے کے پیش کرے گا۔

اگرچہ جے پال نے صلح کی اس شرط کو بظاہر منظور کر لیا لیکن بباطن اس کی نیت خراب تھی چنانچہ اس نے مذکورہ شرط کے پورا کرنے کے بہانے اپنی حکومت کے ایک معتبر رکن دولت کو امیر سبکتگین کے پاس رہن رکھ کر دارالسلطنت کی راہ لی۔

مگر مسلمانوں کی ایک جماعت جسے وہ نذرانے کی مذکورہ رقم ادا کرنے کے لیے اپنے ساتھ لایا تھا۔ بٹھنڈہ پہنچ کر اسے قید کر لیا۔ امیر سبکتگین کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ نہایت غضب ناک ہو کر اسے بدعہدی کی سزا دینے کے لئے ہندوستان کی طرف پھر چل پڑا۔

ادھر جے پال نے ہندوستان کے تمام راجوں مہاراجوں کو لکھ کر بھیجا کہ تمھاری آزادی سخت خطرے میں ہے سبکتگین کی ہلاکت خیزیوں کا ایک شدید طوفان ہندوستان کی جانب چلا آرہا ہے اگر اس وقت تم نے میری مدد کے لیے فوجیں نہ بھیجیں تو ہم سب مٹ جائیں گے۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام راجاؤں نے باوجود جے پال سے ذاتی اختلافات اور دشمنی رکھنے کے امیر سبکتگین کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے اپنے لشکر بھیج دیئے۔ کہتے ہیں کہ جے پال کے جھنڈے تلے امیر سبکتگین کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک لاکھ ہندوستانی سورماؤں کا لشکر جمع تھا۔

اب ایک طرف تو عالم یہ تھا کہ جدھر نگاہ اٹھتی انسانی سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا اور دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ امیر سبکتگین کے پاس چند ہزار افغانی سپاہیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا مگر امیر کی ہمت کی داد دیجیے اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس نے کمال حکمت عملی سے کام لے کر اپنے لشکر کے پانچ پانچ سو کے دستے بنائے اور انہیں باری باری یکے بعد دیگرے دشمن کے مقابلے پر بھیجنا شروع کیا۔ قدرت خدا سبکتگین کے استقلال و پامردی نے چند ہی دنوں میں جے پال کی فوجوں کے حوصلے پست کر دیئے۔ یہاں تک کہ وہ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنے لگیں یہ دیکھ کر حملہ آوروں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا مختصر یہ کہ یہ لوگ اب پنجاب کے بہت سے حصوں پر قابض ہو گئے۔

۳۸۷ ہجری میں امیر سبکتگین کے انتقال کے بعد اس کا اقبال مند فرزند ارجمند سلطان محمود سریر آرائے حکومت ہوا۔

سلطان محمود غزنوی نے لاہور کو فتح کیا جس کے سبب پنجاب محمود غزنوی کی سلطنت میں باقاعدہ طور پر شامل ہو گیا۔ لیکن محمود نے اقامت اختیار نہیں کی بلکہ اپنا ایک گورنر چھوڑ کر غزنی واپس چلا گیا۔ لاہور کے پہلے گورنر کے بارے میں اختلاف ہے بعض نے لکھا ہے کہ سب سے پہلا گورنر سلطان محمود کا پوتا امیر مجدود تھا بعض

کہتے ہیں نہیں۔ اسلطان کا مقرب خاص غلام ایاز تھا جو لوگ امیر مجدود کو لاہور کا گورنر بتانے ہیں۔ وہ ایاز کو اس کا اتالیق ٹھہراتے ہیں۔

۴ ربیع الاول ۴۲۱ھ ہجری میں سلطان محمود غزنوی نے رحلت پائی۔ اس کے بعد سلطان کا بیٹا امیر مسعود مسند نشین ہوا۔ ۴۳۰ھ ہجری میں امیر مسعود باغیوں اور سرکشوں کی گوشمالی کے لیے ہندوستان آیا اس نے آکر ہانسی اور سونی پت کے قلعے فتح کیے اور پھر فتح و کامرانی کے ڈنکے بجاتا ہوا غزنی واپس چلا گیا۔

گویا تسخیر قلوب اہل ہند کا کام ابھی تک باقی تھا جو امیر سبکتگین کی تیغ آبدار سے ہو سکا نہ سلطان محمود کی شمشیر جوہر دار کر سکی اور نہ اس کے فرزند امیر مسعود ہی کی تلوار براں سے ہو سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ دل کی سلطنت پر قبضہ پانا کسی بادشاہ کے بس کا روگ نہیں۔ کوئی بادشاہ کیسا ہی جری اور کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو۔ دلوں پر فتح نہیں پا سکتا۔

دل و دماغ کی تسخیر کے لیے روحانی قوت کی ضرورت ہے اور یہ قوت صرف اسی کے حصے میں آتی ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کے ذکر اور اس کی یاد سے اپنے دماغ کو پاکیزہ اور دل کو آباد کرتے ہیں روح ایک لطیف شے ہے جن بزرگوں کو روحانی لطافتیں حاصل ہو جاتی ہیں وہ اپنے آپ کو دنیاوی کثافتوں اور جسمانی لذتوں سے آلودہ نہیں کرتے۔

بعض ناعاقبت اندیش بزرگان دین پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہندوستان میں ان کی آمد شاہان اسلام کے ایما پر سیاسی اغراض و مصالح پر مبنی تھی۔

لیکن بزرگان دین کے سوانح حیات میں جب ترک لذائذ دنیوی پر ہم پہنچتے ہیں تو شرط انصاف یہ ہے کہ پھر ان کے اخلاق اور نیت پر شبہ کرنے کی مطلق کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ دین اسلام کی محبت اور جناب محمد رسول اللہ کی الفت ہی وہ سرمایہ حیات ہے جسے لے کر بزرگان دین ہندوستان میں اسلام کی روشنی پھیلانے کے لیے وقتاً فوقتاً آتے رہے۔

جناب شیخ ہجویری سے پہلے جناب شیخ اسمٰعیل اور شاہ حسین زنجانی لاہور میں تشریف لاچکے تھے اب جناب شیخ ہجویری کی آمد ہورہی ہے سلطان محمود نے ہندوستان پر جتنے حملے کیے ان کی نوعیت فقط فتوحات کی ہے اور ایک سلطان ہی پر کیا موقوف جتنے شاہان اسلام نے ہندوستان کو اپنی تلوار و شجاعت کے جوہر دکھائے ان میں سے کسی ایک نے بھی ہندوستان میں عیسائیوں کی طرح مشنری اسکول اور کالج قائم کر کے اسلام کی تعلیمات پھیلانے کی باقاعدہ کوشش نہیں کی الغرض فوجی نقطہ نظر سے اگر آپ کے یہاں آنے سے پہلے ہندوستان کی سیاسی حالت یہ تھی تو تمدنی اور معاشی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ حال یہ تھا کہ لوگ تہذیب و تمدن سے اس قدر بیگانہ تھے کہ بھوک لگنے پر درندوں کی طرح اپنے سے کمزور انسانوں کو ہی چیر پھاڑ کر کھا جاتے تھے۔

ظاہر ہے ایسے حالات میں ہندوستان کی مذہبی معاشی اور سیاسی حالت کا کیا نقشہ ہوگا جب آپ علوم ظاہری و باطنی میں تکمیل پاچکے تو آپ کے پیر و مرشد جناب ابو الفضل ختلی نے آپ کو لاہور جانے کا حکم دیا یہ واقعہ فوائد الفواد کے حوالے سے بہت شہرت رکھتا ہے کہ آپ کے لاہور آنے سے پہلے یہاں ایک عارف کامل ولی باکرامت شیخ حسین زنجانی ایک اور بزرگ پہلے سے موجود تھے آپ نے اپنے مرشد کو لاہور میں ان کی موجودگی کی طرف توجہ دلائی۔ جناب ختلی نے فرمایا۔ نہیں تم جاؤ تم کو اس سے کیا مطلب چنانچہ حکم کی تعمیل میں آپ لاہور میں تشریف لے آئے۔

قدرت خدا دیکھیے کہ آپ جس وقت لاہور میں داخل ہو رہے تھے تو جس ... طرف آپ نے اپنے مرشد کی خدمت میں اشارہ کیا تھا یعنی زنجانی وہ دار الفنا سے دار البقا کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ یہ شیخ حسین زنجانی ہی کا جنازہ تھا مگر محققین نے اس واقعے کے بارے میں اختلاف کیا ہے بہرکیف یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ کے دین کی طرف لوگوں کو بلانے والے کسی بزرگ کا جنازہ تھا جو پہلے سے یہاں موجود تھے۔ جب اللہ تعالےٰ کی طرف

سے ان کا وقت ختم ہو گیا تو آپ لاہور میں تشریف لائے اور پھر عمر بھر کے لیئے آپ یہیں کے ہو رہے۔

شہر لاہور کے باہر مغربی حصہ میں ایک قدیمی مندر تھا اور اس کے قریب ہی دریائے راوی گزرتا تھا۔ آپ نے اس مقام کو دیکھ کر فرمایا کہ یہی جگہ ہم فقیروں کے رہنے کے لیے موزوں رہے گی چنانچہ جہاں آج ہندوستان کو نورِ ایمان سے منور کر کے آپ ابدی نیند سو رہے ہیں یہ وہی جگہ ہے جہاں آپ نے آتے ہی قیام فرمایا اور تمام عمر اسی مقام کو تبلیغ اسلام و اشاعت دین کا مرکز بنائے رکھا۔

"تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ نے لاہور میں چھتیس ۳۶ برس تک قیام فرمایا ہے اس عرصہ میں آپ نے جو تالیف قلوب کی طرف توجہ دی ہے اس کا ایک اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ لوگ آپ کو داتا اور گنج بخش کے نام سے پکارنے لگے۔ مگر آپ اپنی کتاب کشف الاسرار میں لکھتے ہیں کہ اے علی خلقِ خدا تجھے گنج بخش کہتی ہے حالانکہ تیرے پاس ایک دانہ تک نہیں تو اس لقب کا خیال اپنے دل میں پیدا نہ کر اور یہ نہ سوچ کہ تجھے لوگوں میں کس قدر مقبولیت حاصل ہے اگر تو نے ایسا خیال کر لیا تو گنہگار ہو گا۔

"گنج بخش" تو فقط وہی ایک پاک ذات ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اس کے ساتھ شرک نہ کرنا اس کی ذات شرک سے پاک ہے خدا وحدہ لاشریک ہے اگر تو نے ایسا کیا تو سمجھ لے کہ تو ہلاک ہو جائے گا۔

آپ کی اس تحریر سے ایک طرف تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے لاہور آنے سے پہلے یہاں کے رہنے والے کس حال میں تھے ان کے اعتقادات یا معتقدات پر کیسی کیسی غیر اسلامی باتوں کا غلبہ تھا۔ دوسری طرف آپ کی سیرت کے وہ پہلو دکھائی دیتے ہیں جن سے متاثر ہو کر یہاں کے رہنے والوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا اور انہیں آپ سے اس قدر محبت بڑھی کہ آپ کے لیے فرطِ جوش میں "داتا" اور "داتا گنج بخش" ایسے غیر اسلامی لفظ منہ سے نکالنے لگے۔

بعض نے لکھا ہے کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی لاہور تشریف لائے

اور آپ کے آستانہ مبارک پر حاضر ہوئے اور چلہ کشی کی۔ لاہور سے جاتے ہوئے فرط جوش میں آپ نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

کہتے ہیں اس وقت سے آپ گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ شعر کی ترکیب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترکیب ہی غلط ہے اس لیے وہ خواجہ معین الدین چشتی کا شعر نہیں ہو سکتا اس اعتبار سے پھر یہ بات بھی تسلیم کی جا سکتی کہ آپ خواجہ کے شعر سے گنج بخش مشہور ہوئے۔

ہو سکتا ہے۔ یہ کسی غیر معروف شاعر کا شعر ہو۔ مگر شعر کی روشنی میں یہ بھی یہ بات قطعی اور حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ آپ لوگوں میں پہلے ہی سے "گنج بخش" مشہور تھے۔ ورنہ شاعر کا ذہن کیونکر اس ترکیب کی طرف جاتا اور اسے اپنے شعر میں باندھتا۔

آپ کی سوانح حیات میں راؤ راجو کی مزاحمت کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے لاہور کے اکثر ہندو اس کے بندہ بے دام تھے اور کسی طرح اس کے حلقہ غلامی سے نہیں نکل سکتے تھے۔

آپ نے اس کے تمام طلسمات کو ایک ایک کر کے توڑ دیا اور آپ کی ایک ہی نگہ التفات نے اسے رائے راجو سے شیخ ہندی بنا دیا۔

راؤ نے جو سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا نائب گورنر تھا آپ کے علم و عمل اور زہد و تقوے کی جو شان دیکھی تو آپ کے قدموں میں گر کے مسلمان ہوا اور شیخ ہندی کا لقب پا کر آپ کے حلقہ ارادت مندی میں شامل ہو گیا۔

جس مقام پر آپ نے قیام کیا وہاں آپ نے اپنی جیب سے ایک مسجد تعمیر کروائی اور اس کے ساتھ ہی ایک مدرسہ قائم کیا جہاں اللہ اور اللہ کے رسول کا نام بلند ہوا اور اس کے دین کے فروغ و اشاعت کی ابتدا ہوئی۔

آپ کے ورود مسعود سے پہلے ہندوستان کی جو حالت تھی اس کا مختصراً

حال پیش کیا جا چکا ہے۔ اب ایک اجمال علم تصوف کا بھی ملاحظہ کر لیجیے وہ لوگ جو صوفیوں کا لبادہ اوڑھ کر ارباب حدیث (اہل تصوف) کے گروہ میں طرح طرح کے غیر اسلامی خیالات لے کر داخل ہو گئے تھے جن سے لوگوں کی نگاہ میں علم تصوف کی وقعت جاتی رہی آپ نے ان کی اصلاح اور ارباب حدیث کے مسلک (تصوف) کی مدافعت میں اپنی مشہور کتاب کشف المحجوب تصنیف کی جس میں ان تمام غیر اسلامی خیالات و معتقدات کا ابطال کیا جس نے تصوف کو قطعی عجمی ذہن کی پیداوار یا ایرانیوں کی افتاد طبع کا نتیجہ ٹھہرایا ہے۔

کشف المحجوب جس پائے کی کتاب ہے جناب نظام الدین دہلوی محبوب الٰہی کے اس قول سے اس کا ایک اندازہ ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں۔ جس کا کوئی مرشد نہ ہو وہ کشف المحجوب کو اپنا مرشد بنا لے۔

یوں تو آپ نے کشف المحجوب کے علاوہ اور بھی کئی ایک کتابیں علم تصوف پر تصنیف کی ہیں مثلاً کشف الاسرار دیوان علی اور منہاج الدین مگر ان سب میں فوقیت صرف کشف المحجوب کو ہے اور اس کے سوا اب آپ کی اور کوئی تصنیف نہیں ملتی۔

کشف المحجوب میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تصوف کے علم پر فارسی کی سب سے پہلی کتاب ہے اور خاص بات یہ ہے کہ کشف المحجوب تصوف کے موضوع پر اس وقت کی ایک مستند کتاب ہے جب کہ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف اور ابن عربی کی فصوص الحکم کا کوئی وجود نہیں تھا یہی سبب ہے کہ اس کتاب میں متاخرین صوفیا کے غلو اور نیم پختہ خیالات و معتقدات نہیں ملتے۔ کشف المحجوب میں اولیائے کرام کے خیالات پیش کیے گئے ہیں جن سے تصوف کے بارے میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے جو بے علم و بے عمل صوفیوں کی بدولت اس میں پیدا ہوئیں۔ مثلاً کشف المحجوب میں لکھا ہے ابو یزید بسطامی کہتے ہیں۔

اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ ہوا میں معلق ہو کر دو زانو بیٹھ جاتا ہے تو اس کی اس کرامت سے دھوکا نہ کھاؤ جب تک اس امر کو نہ دیکھ لو کہ حدود شریعت کی

حفاظت میں اس کی کیا حالت ہے۔

جو شخص قرآن شریف کی تلاوت۔ شریعت کی حمایت جماعت کا التزام جنازے کے ساتھ چلنا اور مریضوں کی عیادت کرنا چھوڑ دے اور شان باطنی کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے بدعتی ہے شیخ سری سقطی کہتے ہیں۔

جو شخص ظاہر میں احکام خداوندی کی پیروی چھوڑ کر علم باطنی کا دعویٰ کرے وہ غلطی پر ہے۔

سیدالطائفہ جنید بغدادی کہتے ہیں۔

جس شخص کو کتاب یاد نہیں۔ حدیث نہیں لکھتا۔ فقہ نہیں سیکھتا اس کی پیروی نہ کرو تصوف کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھنا۔ تصوف کی اصل یہ ہے کہ دنیا کی محبت سے علیحدہ ہو جائے ابوبکر شفاف کہتے ہیں۔

جو شخص ظاہر میں امر و نہی کی حدود ضائع کر دے وہ باطن میں مشاہدۂ قلبی سے محروم رہتا ہے۔

ابوالحسن نوری کہتے ہیں۔

جس شخص کو تم دیکھو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس، ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جو اسے علم شریعت سے خارج کر دے۔ تم اس کے پاس نہ جاؤ۔

ابوحفص کہتے ہیں۔

جس شخص نے اپنے حال احوال اور افعال و اعمال کو کتاب و سنت کے مطابق نہ تولا اور اپنے خطرات کو تہمت نہ لگائی اسے مردوں کے دفتر میں شمار نہ کرو۔

شیوخ صوفیہ کے ان اقوال کی روشنی میں یہ صاف معلوم ہو گیا کہ جن حضرات نے تصوف میں غیر اسلامی خیالات شامل کیے اور ان پر تصوف جدیدہ کی بنیاد رکھی وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں نے علم سے منہ موڑ کر فقط زہد و عبادت کو جان تصوف سمجھ لیا ہے۔

دراصل ارباب حدیث جنہیں صوفیائے قدیم کہتے ہیں ان کے مقاصد بڑے

پاکیزہ اور نیک تھے۔ لیکن جب تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ چلا اور تصوف کا مسلک ایک مستقل فلسفہ بن گیا جب نام نہاد صوفیوں نے علم سے بے نیازی برتنی شروع کی اور اس پر عزلت گزینی کو ترجیح دی۔ حالانکہ قدیم صوفیائے کرام کا یہ مسلک نہیں تھا۔ مثلاً ربیع بن خثیمؒ کہتے ہیں "پہلے علم حاصل کرو پھر گوشہ نشین بنو" ابن عبد اللہ کا قول ہے کہ زائد علم زائد عبادت سے بہتر ہے۔" یوسف ابن اسباطؒ نے فرمایا "علم کا ایک باب حاصل کرنا ستر غزوات سے افضل ہے" معافی بن عمران نے کہا کہ ایک حدیث کا لکھنا مجھے تمام رات کی عبادت سے افضل ہے۔"

علامہ ابن جوزی کہتے ہیں میں نے ایک شخص حسین قزوینی کو دیکھا کہ وہ جامع منصور میں دن کو بہت ٹہلا کرتا تھا میں نے سبب پوچھا تو کہا میں اس بہانے سے نیند کو دور کرتا ہوں میں نے کہا یہ تو شرع کے خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے تو نماز کے وقت میں قیام کر اور سونے کے وقت سو بھی جا۔ آدمی کو چاہیے کہ اعتدال کی راہ اختیار کرے۔

انس بن مالک نے کہا رسول اللہ نے مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا کہ ایک رسّی چھت سے بندھی ہوئی لٹک رہی ہے استفسار فرمایا یہ کیا شے ہے؟ عرض کیا کہ یہ زینب کی رسّی ہے کہ جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی یا اونگھ آتی ہے تو یہ رسّی تھام لیتی ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ اسے کھول دو۔ پھر ارشاد فرمایا کہ تم جب تک چاق و چوبند رہو اس وقت نماز پڑھتے رہو لیکن جب تھکان یا سستی آئے تب اس سے باز رہو۔ جناب عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب تم میں سے کوئی اونگھے تو سو رہے حتیٰ کہ اس کی نیند جاتی رہے اور پھر نماز پڑھے۔

جناب مخدوم علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے مقام و منصب ولایت سے متعلق اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ جہاں جناب خواجہ چشتی اور فرید الدین مسعود ایسے جلیل القدر اولیاء اللہ آپ کے مزار شریف پر حاضر ہو کر چلہ کشی کر چکے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے تاجداروں اور بادشاہوں نے بھی آپ کے آستانہ پر جبہ سائی کی ہے۔

آپ ترک لذات۔ ذکرِ الٰہی اور تزکیہ باطن پر بہت زیادہ زور دیتے تھے بالخصوص تجرد پسند تھے۔ آپ نے والدین کے حکم پر نہایت کم عمری ہی میں یکے بعد دیگرے دو شادیاں کیں مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۴۶۵ ہجری میں آپ نے وفات پائی آپ کا مزار پر انوار لاہور میں مرجع خلائق ہے

شیخ ہجویری کے خیالات

کشف المحجوب کے باب ذکر ملامت میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں شیخ ابو یزید کی خانقاہ میں تین مہینے تک رہا میرا قاعدہ تھا کہ روزانہ غسل کر کے بیٹھتا مگر میری وہ مشکل حل نہ ہوئی جسے لے کر میں یہاں پہنچا تھا ناچار یہاں سے خراسان کو روانہ ہوا راستے میں ایک گاؤں پڑتا تھا جب میں وہاں پہنچا تو مجھے متصوفین کی ایک جماعت نظر آئی میں نے ایک کھردرا لباس پہنا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک ڈنڈا اور پانی کا برتن تھا۔

اس جماعت نے مجھے نہایت حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور ان میں سے کسی نے مجھے نہیں پہچانا ان میں سے کچھ لوگوں نے میرے بارے میں ایک دوسرے سے کہا کہ یہ ہم میں سے نہیں۔ بے شک میں ان میں سے نہیں تھا۔ لیکن میرے لیے وہاں رات گزارنا بھی ضرور تھا چنانچہ ان لوگوں نے مجھے خانقاہ کے نچلے حصے میں ٹھہرایا اور خود بالائی منزل پر چلے گئے۔

کھانے کے وقت مجھے ایک سوکھی روٹی دے دی خود بڑے عمدہ کھانے کھا رہے تھے جس کی خوشبو مجھ تک آ رہی تھی وہ کھانا کھا چکے تو خربوزہ کھانے لگے اور از راہ تمسخر چھلکے مجھ پر پھینکتے اور میرا مذاق اڑاتے رہے مگر وہ جس قدر مجھ پر طنز کرتے اور میرے خلاف باتیں کہتے مجھے ان سے رنج پہنچنے کی بجائے خوشی ہوئی اس طرح ملامت سہنے سے میری مشکل حل ہو گئی اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مشائخ اپنے ہاں انہیں کیوں گوارا کر لیتے ہیں۔

سماع جناب شیخ ہجویری اپنی شہرہ آفاق کتاب کشف المحجوب میں فرماتے ہیں
سماع کا ذوق رکھنے والے اصحاب میں سے ایک تو وہ ہیں جو صرف معانی کو
سنتے ہیں اور الفاظ و صوت کو چنداں اہمیت نہیں دیتے اور ایک وہ ہیں جو نغمہ اور
آواز پر مرتے ہیں مؤخر الذکر گروہ کے احوال باطنی پر تبصرہ و تنقید کرتے ہوئے آگے چل
کر پھر آپ فرماتے ہیں۔ نغمہ و صوت سے وابستگی و ذوق رکھنے میں فائدے بھی ہیں اور
نقصان بھی۔ فائدے کی بات تو یہ ہے کہ حسین و جمیل اور خوشگوار چیزوں کے دیکھنے اور
سننے سے در اصل انسان کی طبیعت میں جذبات اور معنی جوش مارتے ہیں اگر وہ
جذبات و معنی حق پر مبنی ہوں تو انسان کی طبیعت میں حق زور پکڑتا ہے اور اگر باطل
ہوں تو باطل طبیعت میں راسخ ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ جو شخص طبیعت کے لحاظ سے پہلے ہی سے بد فطرت ہو گا وہ جو کچھ بھی
سنے گا وہ سب شر اور فساد ہو گا۔ اس کے برعکس جو شخص نیک خو اور عمدہ فطرت کا ہو گا
وہ جو کچھ بھی سنے گا وہ خیر اور نیک افتاد ہو گا۔

جہاں تک اچھی آواز اور نغمہ کا تعلق ہے انسان کی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ
وہ اس سے ذوق رکھتا ہے۔ البتہ اس سے انسان کی طبیعت پر جو اثرات مرتب
ہوتے ہیں وہ انسانی طبائع کے مختلف ہونے کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اسی حال کے
پیش نظر ہم نغمہ و صوت کے بارے میں کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتے۔ یعنی سماع کو نہ تو
ضرور لازم قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اسے ناجائز ہی کہہ سکتے ہیں۔

جناب شیخ ہجویری فرماتے ہیں۔ بنسری۔ طنبور۔ سارنگی۔ ستار اور ڈھولک وغیرہ
آلات موسیقی شیطان کی ذریت نے انسان کو گمراہ کرنے کے لیے ایجاد کیے ہیں ان کے
سننے سے انسان کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور وہ حسن پرستی اور فسق و
فجور پر مائل ہو جاتا ہے۔

لحن داؤدی کہ موہبت الٰہی ہے گویا اس کے مقابلے میں شیطان کی اولاد
نے اپنی مجلس جمائی چنانچہ جو لوگ جناب داؤد علیہ السلام کی آواز سنتے تھے ذریت

شیطان کی اختراعات پر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک گروہ کو اہل شقاوت کہا گیا دوسرا گروہ اہل سعادت کہلاتا ہے۔

اہل سعادت شیطان کے مزامیر نہیں سنتے۔ انہیں لحن داؤدی ہی پسند ہے لیکن ان کے برعکس اہل شقاوت معنی سے مطلق کوئی واسطہ نہیں رکھتے وہ صرف آواز اور ساز کے شیدائی ہیں حقیقت میں یہی وہ لوگ ہیں جو سماع کی حقیقت اور واقفیت سے بالکل بے خبر ہیں اور کلیتہً حرص و ہوس کے بندے ہیں اور اسی کے دام میں گرفتار ہیں۔

شرع کی رو سے راگ، ساز، ستار باجے وغیرہ مزامیر سننا قطعی ناجائز ہے جو شخص اسے جائز خیال کرتا ہے یا اس کے جائز ہونے کا جواز تلاش کرتا ہے۔ وہ اسلام سے اپنا کچھ تعلق نہیں رکھتا بعض لوگ سماع کی مجلس میں ناچتے اور اپنے تن کے کپڑے پھاڑنے لگتے ہیں۔ علمائے حقہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ناچنا فسق و فجور میں داخل ہے اور کپڑے پھاڑنا برہنہ ہونا عریانی میں شامل ہے۔ البتہ وہ لوگ جو شدت جذبات سے ایسا کرتے ہیں جنہیں اپنے آپ کا مطلق ہوش نہیں رہتا وہ اس سے بری ہیں۔

لیکن وہ لوگ جو صاحبان حال نہیں بلکہ جھوٹی اور مصنوعی واردات وکیفیات قلبی پیدا کر کے ناچتے، گاتے یا کپڑے پھاڑنے لگتے ہیں صریحاً مسخرے ہیں اور وہ ایسا کرنے سے بزرگان دین کی تذلیل کا باعث بنتے ہیں ان کا یہ فعل قطعی ناپسندیدہ اور ناجائز ہے صوفیائے اسلام سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔

رقص سے شہوانی جذبات ابھرتے ہیں اور زنا کے فعل کی تحریک ہوتی ہے بلاشبہ رقص شیطان کا حربہ ہے جو نام نہاد صوفی رقص کو جائز خیال کرتے ہیں وہ تصوف تو ایک طرف خود اپنی ذات سے بھی دھوکہ کرتے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک وجد ہی کا دوسرا نام رقص ہے نہیں یہ بالکل غلط ہے اصل میں وجد رقص ایک دوسرے سے بالکل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان دونوں میں واضح فرق یہ ہے کہ وہ حرکات وسکنات جسم جو رقص میں پیدا ہوتی ہیں وجد میں نہیں ہوتیں۔ وجد ایک زبانی کیفیت ہے۔
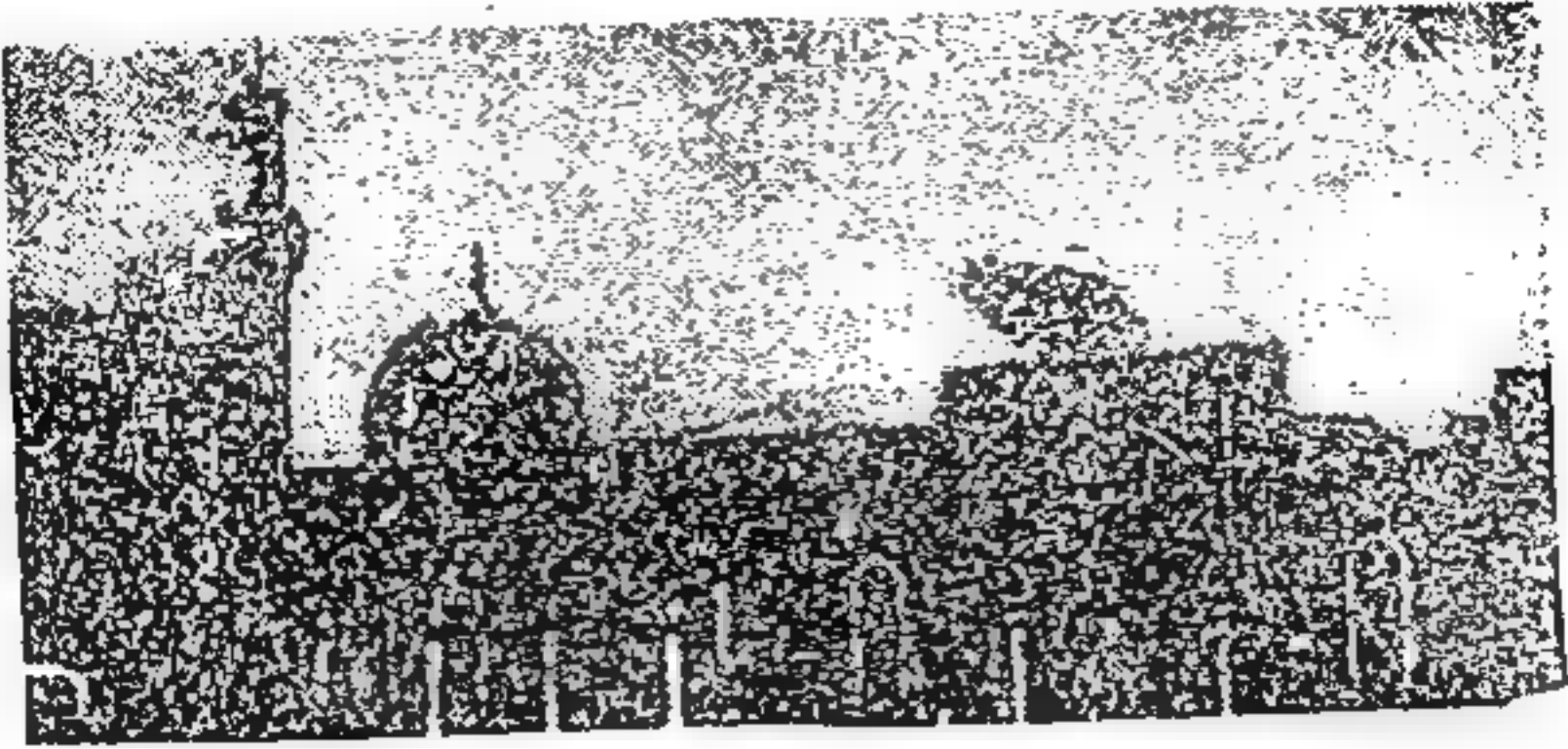
پیدائش

(۴۷۰ ہجری قصبہ گیلان شہر فارس میں پیدا ہوئے محی الدین لقب اسم گرامی عبدالقادر۔ والد کی طرف سے حسنی والدہ کی طرف کی حسینی یعنی نجیب الطرفین ہاشمی سید تھے)

عربی میں قاعدہ ہے کہ گاف کے حرف کو جیم سے بدل دیتے ہیں اس لیے گیلان کی مناسبت سے آپ کو گیلان کی بجائے جیلانی کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کے جدِّ اعلیٰ کا اسمِ گرامی جیلان ابوعبداللہ صومعی تھا اس رعایت سے آپ جیلانی کہلاتے ہیں لیکن آپ کے نسب نامہ میں اس نام کے کوئی بزرگ نہیں تھے اس لیے یہ بیان صحیح نہیں۔ اصل میں آپ کے نانا کا نام ابوعبداللہ صومعی تھا مگر ان کے ساتھ یعنی جیلان کا لفظ کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ پس آپ کو جدِّ اعلیٰ کی مناسبت سے جیلانی کہنا درست نہیں۔

مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں طبقات حنابلہ میں علامہ ابوالفرج عبدالرحمان شہاب نے اور ان کی تائید میں اکثر دیگر تذکرہ نگاروں نے آپ کو والد

کی طرف سے حسنی لکھا ہے اور نسب نامہ یوں بیان کیا ہے۔ شیخ عبد القادر بن صالح بن موسیٰ بن عبد اللہ بن یحییٰ زاہد بن محمد داؤد بن موسیٰ الجون بن عبد اللہ المحض بن حسن مثنیٰ ابن سید امام حسن بن امیر المومنین علی ابن ابی طالب قریشی ہاشمی۔

بعض روایات میں آپ کا شجرہ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ شیخ عبد القادر بن ابو صالح جنگی بن موسیٰ بن یحییٰ زاہد بن محمد داؤد بن موسیٰ الثانی بن عبد اللہ الثانی بن موسیٰ الجون بن عبد اللہ المحض بن حسن مثنیٰ ابن سیدنا امام حسن بن امیر المومنین علی ابن ابی طالب۔

ان کے علاوہ بعضوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔ شیخ عبد القادر ابو محمد ابن ابو صالح بن موسیٰ بن عبد اللہ جیلی بن یحییٰ زاہد بن محمد داؤد بن موسیٰ بن عبد اللہ بن موسیٰ بن عبد اللہ المحض بن حسن مثنیٰ بن سیدنا امام حسن بن امیر المومنین علی ابن ابی طالب قریشی ہاشمی۔

آپ کے والد محترم جناب ابو صالح نہایت متقی، عابد و زاہد اور ایک پرہیزگار بزرگ تھے گویا اسم با مسمیٰ۔ آپ کے تقوے اور دینداری کا اندازہ کچھ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نہر میں بہتا ہوا ایک سیب آپ کے ہاتھ آگیا سیب نہایت خوش رنگ تھا۔ طبیعت چاہی چنانچہ کھا لیا۔ مگر کھاتے ہی معاً خیال آیا کہ معلوم نہیں کہ یہ کس کے باغ کا سیب ہے۔ باغبان کی اجازت کے بغیر کھانا "اکل حلال" نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اب نہر کے کنارے کنارے سیب کے مالک کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے کہ اس سے جا کر معافی مانگیں۔

جوئندہ یابندہ بالآخر ایک باغ میں پہنچ گئے اور وہاں آپ نے اس بات کا صحیح اندازہ لگا لیا کہ یہ سیب اسی باغ کا ہے اس باغ کے مالک جناب عبد اللہ صومعی تھے۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ عرض کر کے خواستگار معافی ہوئے۔ دل را دل می شناسد کے بمصداق جناب صومعی نے دیکھا کہ ایک طرف عنفوان شباب ہے لیکن دوسری طرف تقوے و طہارت کا یہ عالم ہے کہ طبیعت میں جوانی کی شوخی و شرارت مطلق نہیں۔ دل نے کہا یہ ضرور کسی اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے۔

جناب سید عبداللہ صومعی نے آپ سے فرمایا کہ آپ کو معافی اس شرط پر دی جا سکتی ہے کہ آپ میری اندھی، گونگی، اپاہج اور بہری بیٹی کو اپنی بیوی بنانا قبول کر لیں۔ آپ نے منظور کر لیا چنانچہ شادی ہوگئی۔

حجلہ عروسی میں گئے وہاں اپنے گمان و خیال کے برعکس پایا۔ انہوں نے دیکھا کہ نہایت حسین وجمیل عورت ہے اور اس کے تمام اعضا صحیح وسالم ہیں۔ سخت پریشانی ہوئی قریب تھا کہ کسی الجھن میں پڑ جاتے کہ آپ کے خسر نامدار نے اسے رفع کر دیا۔ فرمایا ہاں یہی تمہاری بیوی ہے میں نے جو کچھ کہا تھا وہ درست ہے میرا مطلب ان باتوں سے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میری بیٹی ایسی تربیت یافتہ ہے کہ احکام الٰہی کے خلاف کبھی بھی شیطان کے بہکائے نہیں بہک سکتی۔

یہ بی بی جناب فاطمہ ام الخیر تھیں جن کے آغوش امومت میں جناب سید عبدالقادر جیلانی نے پرورش و تربیت پائی آپ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھیں آپ کا شجرہ نسب یوں ہے۔ سیدہ ام الخیر بی بی فاطمہ بنت سید عبداللہ صومعی بن ابو جمال بن محمد بن محمود بن ابو العطاء عبداللہ بن کمال الدین عیسٰی بن ابو علاؤالدین محمد الجواد بن علی الرضا بن موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام باقر بن امام زین العابدین بن سیدنا امام حسین ابن امیر المومنین علی ابن ابی طالب قریشی ہاشمی۔

"تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ امتہ الخیر بی بی فاطمہ جب ساٹھ برس کی عمر کو پہنچیں تب آپ کے بڑھاپے اور عالم یاس میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس عمر میں اولاد کا منہ دیکھنا کسی طرح معجزے سے کم نہیں۔ آپ کے عادات وخصائل کے بارے میں لکھا ہے کہ عام بچوں سے بالکل مختلف تھے یعنی عالم طفلی میں بھی دودھ کے لیے کبھی نہ روتے تھے نہ چلاتے تھے۔ کسی نے پلا دیا پی لیا ورنہ چپ رہے اور گہوارے میں پڑے ہاتھ پیر چلاتے رہے۔

ابھی ہوش نہ سنبھالنے پائے تھے کہ والد محترم اللہ کو پیارے ہوگئے آپ کے نانا جناب عبداللہ صومعی حیات تھے اب وہی آپ کے سرپرست بنے۔ نانا کا چونکہ اپنا کوئی

فرزند نہیں تھا اس لیے انہوں نے آپ ہی کو فرزند بنا لیا اور تمام تر جائداد آپ کے نام وقف کر دی۔

جب آپ چار پانچ برس کے ہوئے تو بی بی فاطمہ نے آپ کو مکتب میں بٹھا دیا۔ دس بارہ برس کی عمر تک اسی مدرسے میں تعلیم پاتے رہے اسی دوران میں آپ کے نانا جناب سید عبیداللہ صومعی کو بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بلاوا آ گیا اب لے دے کر صرف آپ کی والدہ محترم سیدہ فاطمہ ہی تھیں جن کے کندھوں پر تمام گھر کے انتظام کا بار تھا اور ان کی امیدوں کا واحد مرکز آپ تھے۔

سیدہ فاطمہ اٹھتر برس کی تھیں کہ آپ نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بغداد جانے کی خواہش پیش کی۔ ظاہر ہے کہ ایسے عالم میں سیدہ فاطمہ کے دل پر کیا گزری ہوگی مگر فرمان نبوی کے پیش نظر کہ اطلب العلم ولو کان بالصین۔ تم علم سیکھو خواہ اس کے لیے تمہیں چین جانا پڑے انہوں نے آپ کو باچشم گریاں اجازت دے دی اور فرمایا تمہارے بابا نے اسی دینار ترکہ میں چھوڑے تھے ان میں سے چالیس دینار تم لے جاؤ اور چالیس دینار تمہارے بھائی کے لیے رکھ لیتی ہوں آپ بغداد پہنچ کر سلطان نظام الملک کے مدرسہ عالیہ نظامیہ بغداد میں داخل ہوئے علامہ شیخ ابوسعید اس مدرسے کے مہتمم تھے آپ نے جناب شیخ سے درس قرآن حکیم حاصل کیا پھر قواعد تجوید، علم تفسیر، فقہ اور اصول حدیث کی تعلیم پائی۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ علوم عقلی و نقلی میں ایک متبحر عالم ہو گئے۔

آپ کے بزرگ استاد جناب شیخ نے تکمیل کے بعد آپ سے اسی مدرسہ میں طلبا کو تعلیم دینے پر اصرار کیا الامر فوق الادب کے پیش نظر آپ نے استاد کے حکم کی تعمیل کی اور مدرسہ نظامیہ بغداد میں طلباء کو تعلیم دینے لگے۔

درس و تدریس کا جو انداز قدرت نے آپ کو عطا کیا تھا وہ آپ کے زمانے کے کسی مدرس یا معلم کو حاصل نہ تھا۔ حاصل کلام یہ کہ آپ ایک تھوڑی ہی مدت میں عالم متبحر و عارف کامل کی حیثیت سے شہرت پا گئے۔

آپ کی ذہانت و فطانت کا عالم یہ تھا کہ مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق مسئلہ جو

بڑے بڑے علما سے حل نہ ہوتا تھا ایک ثانیہ کی مہلت میں حل کر کے رکھ دیتے تھے۔

مختصر یہ کہ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ نے علوم باطنی کی تحصیل کے لیے استاد علامہ شیخ ابوسعید مبارک علی مخزومی کے مرید ہوئے۔ مخزومی شیخ ابوالحسن علی بن محمد القرشی کے مرید تھے۔ ابوالحسن شیخ ابوالفرح طرطوسی کے مرید تھے۔ طرطوسی، ابوالفضل عبدالواحد تمیمی کے مرید تھے۔ تمیمی شیخ ابوبکر شبلی کے مرید تھے۔ شبلی شیخ جنید بغدادی کے مرید تھے۔ بغدادی اپنے ماموں شیخ سر سقطی کے مرید تھے۔ سقطی، شیخ معروف کرخی کے مرید تھے کرخی، شیخ داؤد طائی کے مرید تھے۔ طائی شیخ حبیب عجمی کے مرید تھے۔ عجمی خواجہ حسن بصری کے مرید تھے۔ بصری امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے مرید و شاگرد تھے۔

آپ سے طریقت کا جو سلسلہ آگے چلا وہ آپ ہی کے نام نامی پر سلسلہ قادریہ سے موسوم ہوا۔ آپ کی بزرگی اور علمی فضیلت و شخصی کمال کے اعتراف کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی۔ کہ طریقت کے تمام سلسلوں میں آپ کا فیض جاری ہے اور بلا استثناء طریقت کے تمام سلسلے کے بزرگوں نے آپ کو اولیائے کبار کی فہرست میں سب سے افضل تسلیم کیا ہے۔

پچیس برس کا سن جوانی کی شوخیوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ آپ نے اس عمر میں پہنچ کر بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے اور نفس کی ہر اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا جس سے انسان کے دل میں دنیا سے رغبت پیدا ہوتی ہے اور وہ دنیا ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب جناب جیلانی پچاس برس کے ہوئے تو آپ نے جامع بغداد میں وعظ کہنا شروع کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی بلند آواز عطا فرمائی کہ دور و نزدیک ہر جگہ سے یکساں سنائی دیتی تھی۔

اور یہ بھی آپ ہی کے بیان ترجمان قرآن کا اثر تھا کہ لوگ وعظ سنتے سنتے مبہوت ہو جاتے اور مجمع کا یہ عالم ہوتا کہ جامع مسجد میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہتی۔ بڑے بڑے علماء مشائخ آپ کے وعظ میں شریک ہوتے اور گوش ہوش وا کرتے۔

کہتے ہیں چار سو علماء آپ کے وعظ میں اس لیے شریک ہوتے کہ آپ کے ارشادات

قلمبند کریں۔ اور کتنے ہی یہودی اور عیسائی آنے کہ آپ کی زبان ترجمان قرآن سے وعظ سن کر مسلمان ہو جاتے لکھا ہے کہ آپ کے دست حق پرست پر پانچ سو سے زیادہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اسلام قبول کیا۔

اصلاح احوال کا جو اسلوب آپ نے اختیار کیا وہ آپ کے زمانے میں کسی کو میسر نہیں تھا۔ اخلاق سنوارنے اور بگڑے ہوئے لوگوں کے احوال سدھارنے میں بڑی سے بڑی حکومت بھی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مگر آپ کی ایک ہی نگہ التفات بڑے بڑے سرکشوں ڈاکوؤں۔ رہزنوں اور چوروں پر وہ کام کر گئی کہ ان کے دل و دماغ کو ایسا مسلمان کیا۔ فکر و نظر میں ایسی جلا پیدا کی کہ انہوں نے سیدھی راہ کو چھوڑ کر پھر کبھی گمراہی کا راستہ اختیار نہ کیا اس سلسلے میں ایک ادنیٰ سی مثال آپ کے بچپن ہی کے زمانے کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب آپ مرتبہ ولایت پر پہنچے تو اس وقت آپ کی زبان ترجمان قرآن میں کیا اثر تھا۔ اور آپ کس شان کے بزرگ تھے۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ چودہ برس کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک قافلہ کے ساتھ بغداد کو روانہ ہوئے والدہ محترمہ نے آپ کی گدڑی میں چالیس اشرفیاں رکھ کر اس مقصد کے لیے سی دیں کہ حفاظت سے رہیں اور ضرورت کے وقت کام آسکیں بدقسمتی سے راستے میں ڈاکہ پڑا جو شے جس کے ہاتھ آئی ڈاکوؤں نے اس سے بڑی بے دردی سے چھین لی۔

ڈاکوؤں نے آپ سے پوچھا تمہارے پاس کیا ہے، آپ نے کہا چالیس اشرفیاں ڈاکو سمجھے آپ نے ہم سے مذاق کیا ہے۔ چنانچہ آپ کو اپنے سردار احمد الفی کے پاس لے گئے اور ماجرا بیان کیا۔ سردار نے بھی آپ سے یہی پوچھا اور آپ نے اسے بھی یہی جواب دیا۔ اس نے کہا اچھا لاؤ دکھاؤ تو وہ چالیس اشرفیاں کہاں ہیں۔ آپ نے گدڑی ادھیڑی اور اشرفیاں نکال کے ان کے سامنے رکھ دیں۔

ڈاکو بہت حیران ہوئے۔ سردار نے کہا اے لڑکے تو نے ایسی چھپی ہوئی چیز جو

ہزار کوششوں کے باوجود بھی ہمارے ہاتھ نہ آسکتی تھی کیوں ظاہر کردی آپ نے جواب دیا میں تعلیم کی غرض سے بغداد جا رہا ہوں یہ اشرفیاں میری والدہ نے سفر کے خرچ کے لئے میری گدڑی میں رکھی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بڑی شدت سے تاکید کی کہ سچ کو کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا ہمیشہ سچ بولنا۔ ڈاکوؤں کے دل پر آپ کی بات نے کچھ ایسا اثر کیا کہ فوراً ڈکیتی سے توبہ کرکے پارسائی اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ یہ لوگ چوروں اور ڈاکوؤں کی صف سے نکل کر اللہ کے دوستوں میں شمار ہوئے۔

احکام شریعت کی پابندی اور اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت بچپن ہی سے آپ کے دل میں جاگزیں تھی جب تحصیل علم سے فارغ ہوکر آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے عارف عظیم المرتبت ولی اللہ ہوئے تو اس وقت بھی آپ کا یہ عالم تھا کہ سلام کرنے میں پہل فرماتے تھے۔

چھوٹوں پر شفقت فرماتے اور بڑوں کی تعظیم کرتے۔ کمزوروں ضعیفوں۔ غریبوں اور حاجت مندوں کی دستگیری فرماتے ان کی ضرورتیں پوری کرتے لیکن کسی دولتمند یا امیر اور رئیس کو کبھی خاطر میں نہ لاتے اور نہ کبھی اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے آپ غریبوں کے گھر پر اکثر خود چل کر جاتے اور ان کی مزاج پرسی کرتے۔ لیکن کسی دولتمند کے دروازے پر کبھی قدم نہ رکھتے۔ بادشاہ وقت سے لے کر تمام اراکین حکومت تک کبھی کسی کی پروا نہ کرتے۔

اگر کسی ضرورت مند و محتاج و بے نوا کے بارے میں کسی حاکم سے کچھ کہنا ہوتا تو اسے سفارش کے طور پر لجاجت کے ساتھ نہ لکھتے نہ کہتے بلکہ تحکمانہ انداز میں فرمان لکھتے اور حکم دیتے کہ اس کی ضرورت کو پورا کیا جائے اور اس کی بات سنی جائے۔

صاحب طبقات نے لکھا ہے کہ آپ نے ۵۲۰ ہجری میں وعظ کہنا شروع کیا۔ تمام اراکین حکومت آپ کے وعظ میں شریک ہوتے اور آپ کی تنقید حکومت پر بڑی سخت ہوتی لیکن کسی کی مجال نہیں تھی جو آپ کے بیان پر ذرا سی گرفت بھی کرسکے۔ اکثر دس دس اور بیس بیس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ مگر کسی میں بھی اتنا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ

آپ کے سامنے لب کشائی کر سکتا۔

آپ کے وعظ کا ماحصل یہ تھا کہ اے لوگو اللہ اور اللہ کے رسول کی پیروی کرو اس کے احکام پر صدق دل سے عمل کرو۔ دین میں کوئی نئی بات نہ پیدا کرو۔ خدا کی نافرمانی ہرگز نہ کرو۔ صبر کرو بے صبر نہ بنو۔ کشائش کا انتظار کرنا چاہیے۔ نا امید نہ ہونا چاہیے اللہ تعالےٰ کے ذکر پر سب ایک ہو جاؤ۔ اور آپس میں نا اتفاقی پیدا نہ کرو۔ توبہ کر کے گناہوں سے پاک ہو جاؤ ان سے آلودہ نہ ہو جاؤ اور اپنے مولا کے دروازے سے نہ ہٹو۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا جب میں فرائض کے بعد اچھے کاموں پر غور کرتا ہوں تو محتاجوں اور مہمانوں کو کھانا کھلانے اور عام و خاص کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے اور دشواریوں میں ہاتھ بٹانے سے بہتر کسی کام کو نہیں پاتا۔ اگر دنیا کی تمام دولتوں کے خزانے مجھے مل جاتے تو میں سب کے سب فقیروں اور مسکینوں پر خرچ کر دیتا۔ غریبوں اور ضرورتمندوں کو کھلا دیتا یہ ہیں وہ درحقیقت آپ کے نیک خیالات و عزائم جن کی وجہ سے آپ کو پیر دستگیر غریبوں کا ہاتھ پکڑنے والا اور غوث الاعظم کہا جاتا ہے۔ یعنی اولاد آدم سے غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے والا سب سے بڑا انسان۔ آپ کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ آپ محتاجوں اور مہمانوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے حتیٰ کہ غریبوں اور مسکینوں میں بیٹھ کر تو آپ کو بے پناہ مسرت ہوتی۔ آپ فرمایا کرتے کہ امیروں اور دولت مندوں کے ساتھ بیٹھنے کی آرزو تو ہر شخص کرتا ہے۔ لیکن حقیقی سعادت و مسرت انہی کو حاصل ہوتی ہے جن کو مسکینوں اور غریبوں کی ہم نشینی کی آرزو رہتی ہے۔

آپ کا یہ قاعدہ تھا کہ مریدین و معتقدین جو تحفے تحائف اور بڑی بڑی رقمیں نذرانے کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کرتے۔ وہ اسی وقت غریبوں میں تقسیم کر دیتے ایک موقع پر آپ خود فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں روپیہ پیسہ مال و دولت مطلق نہیں ٹھہرتا اگر صبح میرے پاس ہزار دینار آئیں تو شام تک ان میں سے ایک بھی دینار باقی نہ رہے آپ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم سمجھتے آپ کے دروازے سے کبھی کوئی سائل خالی نہیں گیا۔ اگر آپ کے پاس کسی وقت رقم نہ ہوتی تو سائل کو اپنے تن کے

کے کپڑے اُتار کر دے دیتے۔ مخدوم جہانیاں گشت کہتے ہیں کہ آپ بعض اوقات سو سو غلام خریدتے اور اسی وقت انہیں آزاد کر دیتے تھے

خیر یہ تو شان آپ کے جمال کے پہلو کی تھی۔ اب ذرا شان جلال دیکھئے۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ خلیفہ بغداد المقتفی نے ابن مرجم کو جو ظالم کے نام سے مشہور تھا شہر کا قاضی مقرر کیا۔ اس کے عہدہ قضا پر تقرر سے لوگوں میں سخت بے اطمینانی و تشویش پھیل گئی۔ لوگوں نے آپ کی خدمت میں شکایت کی۔ اس پر آپ نے بر سر منبر خلیفہ بغداد سے مخاطب ہو کر فرمایا "آپ نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو قاضی (منصف یا جج) مقرر کیا ہے جو سخت ظالم ہے۔ کل جب آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچیں گے تو اس وقت اللہ کو کیا جواب دیں گے؟ وہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان اور شفیق ہے" کہتے ہیں خلیفہ آپ کے یہ کلمات سن کر لرزنے لگا اور اُس نے فوراً ہی ابن مرجم کو قضا کے عہدے سے علیحدہ کر دیا۔

ایک مرتبہ آپ مسجد میں بیٹھے وعظ کہہ رہے تھے کہ اسی دوران میں آپ کو چھینک آئی آپ نے الحمدللہ کہا۔ لوگوں نے اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہا تو مسجد لوگوں کے مجمع کی آواز سے گونج اٹھی۔ خلیفہ بغداد نے جو اس وقت وہاں موجود تھے حیرت سے پوچھا یہ کیا ہوا جواب ملا کہ سیدنا عبدالقادر جیلانی کو چھینک آئی ہے لوگ اس کا جواب دے رہے ہیں اس پر خلیفہ بغداد نے کہا اصل میں حکومت تو یہ ہے۔

دلوں پر حکومت دلوں کو موہ لینے سے قائم ہوتی ہے۔ دل کا موہ لینا ہزار عبادتوں کی ایک عبادت ہے سے

دل بدست آور کہ حج اکبر است   صد ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

آپ کو ایک زمانہ پیرو دستگیر اور غوث الاعظم و محبوب صمدانی و سبحانی وغیرہ ناموں سے جو یاد کرتا ہے ہر چند اس میں شرک کا پہلو نکلتا ہے تاہم یہ اسی جذبے کے اظہار کی ایک صورت ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں غریبوں اور مسکینوں اور

محتاجوں سے محبت کرنے کے لیے پیدا کیا۔

ایک مرتبہ طالب علمی کے زمانے میں آپ کو سامان خورد و نوش کی سخت دشواری پیش آئی۔ ایک پھوٹی کوڑی پاس نہیں تھی مگر بھوک کے مارے سخت برا حال ہو رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص بھنا ہوا گوشت اور تازہ تازہ روٹیاں لے کر مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے ان کا جو یہ حال دیکھا تو نہایت اصرار کر کے کھانے پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ باتوں باتوں میں اس نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں آپ نے کہا تعلیم پا رہا ہوں۔ اس نے کہا گیلان سے بھی ایک نوجوان عبدالقادر حصول تعلیم کے لیے یہاں بغداد آیا ہوا ہے کیا تم اسے جانتے ہو؟ آپ نے کہا جی وہ میں ہی عبدالقادر ہوں۔ اس جواب پر وہ شخص سخت بے چین اور آبدیدہ ہو کر بولا۔ بھائی تم میرے مہمان نہیں بلکہ اب میں تمہارا مہمان ہوں۔ تمہاری والدہ نے تمہارے خرچ کے لیے آٹھ دینار دیئے تھے کہ تمہیں پہنچا دوں مگر مجھ سے تمہاری امانت میں خیانت ہو گئی۔ آپ نہایت صبر و اطمینان کے ساتھ خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے اس نے کہا میرے ساتھ ہوا یوں کہ میں نے آپ کو بغداد میں بہت ڈھونڈا کئی دن آپ کی تلاش میں لگ گئے اس مدت میں میرا ذاتی خرچ جو میں اپنے ساتھ لایا تھا ختم ہو گیا جب لگا بھوکوں مرنے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو میں نے آج یہ رقم صرف کر کے کھانا خرید لیا۔ جسے ابھی ابھی ہم دونوں نے مل کر کھایا ہے۔

آپ نے یہ تمام بات سن کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے حسن خیال و نیت کی تعریف کی اور اسے تسلی دی اس کے بعد جو کچھ بچا ہوا کھانا دے کر اسے نہایت محبت کے ساتھ رخصت کیا۔

آٹھ دینار اور قحط کے ایام پر غور کیجیے اس زمانے میں اس تھوڑی سی رقم کی کتنی بڑی اہمیت ہو گی لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اسے بخش دی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ان اللہ مع الصابرین اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ قحط کی ہولناکی کے انہی دنوں میں آپ نے بھوکے ننگے فقیروں کی ایک جماعت کو دیکھا کہ شدید فاقہ کشی میں زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی اسے دیکھ کر آپ کی

طبیعت میں بے حد ملال پیدا ہوا پروردگار سے دعا کی اور اس نے فوراً قبول کی آپ ان فقیروں کے حال سے متاثر ہو کر تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک شخص ملا اور اس نے سونے کا ایک ٹکڑا آپ کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ یہ ٹکڑا آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کے اخراجات کے لیے بھیجا ہے آپ بازار گئے بقدر ضرورت سونا فروخت کیا اس سے جو دام میسر آئے ان سے سب سے پہلے انہی فقیروں کی فاقہ کشی دور کی۔

آپ کے زمانہ ولادت میں بغداد مذہبی و سیاسی بدحوالی میں مبتلا تھا مذہب کا حال تو یہ تھا کہ دین کے نام پر طرح طرح کے فرقے اور گروہ بن چکے تھے اور ان کے عقائد میں ایسی ایسی باتیں داخل ہو چکی تھیں کہ ان کا دین اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ خاص کر اسمٰعیلی فرقے کی باطنی تحریک نے تو خوب ہی اودھم مچا رکھا تھا۔ دوسری طرف خلفائے عباسیہ کا ستارہ اقبال زوال پذیر تھا۔ ان کی حیثیت خلافت کے تخت پر مذہبی پیشواؤں سے زیادہ نہیں تھی۔ حالات یہ تھے کہ سلاطین سلاجقہ آپس میں لڑ رہے تھے اور ان میں سے جس کی قوت زیادہ ہو جاتی اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا اور بغداد میں اس کے خلاف کسی میں دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔

ان احوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ دشمنانِ اسلام نے سر اٹھایا اور میدان کارزار گرم کیا۔ تمام عیسائیوں نے متحد ہو کر عالم اسلام پر یلغار کر دی۔ تاریخ اسلام میں یہ لڑائی پہلی جنگ صلیبی کے نام سے مشہور ہے اب ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ اپنوں اپنوں میں اقتدار و حکومت کے لیے تلوار چل رہی ہے کہیں ایک دوسرے کے خلاف مذہب کی آڑ لے کر طرح طرح کی غیر اسلامی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں جن میں اسمٰعیلی شیعوں کی تحریک باطنیت سرفہرست ہے اور دوسری طرف اسلام کو مٹانے کے لیے کفر و باطل کی تمام قوتیں مجتمع ہو کر مسلمانوں کے مقابلے پر آ گئیں۔ اب ان حالات میں کسی قوم میں خواہ کتنی ہی قوت عزم جوش اور ولولہ جہاد کیوں نہ ہو وہ جب تک متحد نہیں ہوتی اور اس کا مرکز ایک نہیں ہوتا اس کا وجود و عدم دونوں برابر ہیں۔

کسی قوم کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنے اور اس کے آپس کے اختلافات کو دبانے کے لیے

ایک ایسی تبلیغ سے بڑھ کر کوئی ایسا موثر ذریعہ نہیں ہو سکتا جس میں فروعی اختلافات سے قطع نظر صرف اصولوں پر زور دیا جائے۔

آپ نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا تو اس میں اپنی ذات کو مرکز نہیں بنایا بلکہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات پر تمام مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش فرمائی حکومت و اقتدار کے لیے دین و مذہب کے نام پر مسلمانوں میں جو مختلف گروہ بن چکے تھے ان کے اغراض و مقاصد کی نقاب کشائی کی۔

آپ نے اپنے جد امجد جناب سیدنا امام حسن کا اخلاق و کردار ہر مرحلے اور زندگی کے ہر گام پر پیش نظر رکھا یعنی امام حسن نے دیکھا کہ ان کے رفقا وقت پر ساتھ نہیں دیں گے اور خلافت سے علیحدگی پر خون کی ندیاں بہنے سے رک سکتی ہیں چنانچہ آپ علیحدہ ہو گئے اور اس طرح آپ نے مسلمانوں کو باہمی کشت و خون اور جنگ وجدل سے بچا لیا۔

جب سیدنا امام حسین بیوی بچوں اور جان نثاروں کو ساتھ لے کر گھر سے چلے تھے تو آپ نے کسی سے لڑنے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا کوفے والوں کے خط پر خط آ رہے تھے آپ ان کی دعوت پر کوفہ کو روانہ ہوئے کوفہ پہنچ کر آپ کو جو حالات پیش آئے۔ لوگوں نے سرد مہری سے کام لیا اس وقت بھی آپ نے کسی سے جنگ وجدل کرنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ واپس جانے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ کہا کہ مجھے یزید سے مل کر اپنا معاملہ طے کر لینے کی مہلت دے دی جائے اور اگر یہ گوارا نہ ہو تو کسی مہم پر بھیج دیا جائے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی اجازت ہو یہ باتیں آپ نے کیوں کہیں؟ صرف اس لیے کہ محمد رسول اللہ کی امت میں آپ کے نواسے کے لیے باہمی تلوار نہ چلنے پائے۔

آپ نے اپنے دادا جناب حسن اور نانا جناب حسین کے اخلاق مطہرہ کی پوری پوری پیروی کی ہے آپ نے اپنے وعظ میں اسلام کے صرف اصولوں کی تبلیغ کی۔ اور حکومت و سیاست کے معاملات میں قطعاً اپنے آپ کو نہیں الجھایا یہی سبب ہے کہ آپ نے لاکھوں انسانوں کے دلوں پر مکمل حکمرانی کی اور ایسی حکمرانی کہ تخت و تاج کے مالکوں کو رشک آتا تھا۔ آپ کے پر اخلاص ارشادات و نصائح نے جن کی اثر انگیزی کے مقابلے میں دنیا کی بڑی بڑی

طاقتیں ہیچ ہیں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹ جانے سے بچالیا یہی وہ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس کے سبب سے اسلامی دنیا آپ کو محی الدین (دین کو زندہ کرنے والا) کے لقب سے یاد کرتی ہے اور یہی وہ سب سے بڑا فریضہ ہے جس کے ادا کرنے پر آپ کا مرتبہ بلند ہوا کہ تمام اولیائے کرام آپ کے قدموں میں سر رکھتے ہیں اور آپ کے طریقے میں داخل ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہندوستان میں آپ کا سلسلۂ قادریہ سلطان سکندر خاں لودھی کے عہد حکومت میں جناب سیّد محمد غوث گوالیاری سے پھیلا جناب غوث نو واسطوں سے اپنے جدامجد جناب سیّد عبدالقادر جیلانی سے جا ملتے ہیں۔

جناب غوث علاقہ اوچھ ضلع ملتان کے قریب ۱۴۸۲ء میں مقیم ہوئے۔ آپ کے زمانہ میں ہندوستان کی مذہبی فضا کو ہموار کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں اور اس کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے معتقدات کو باہم ملا جلا کر ایک ایسا گروہ پیدا کیا جارہا تھا جس کی تعلیمات میں دونوں گروہوں کے اعتقادات و مذہب کا رنگ موجود تھا۔ بھگت کبیر جو ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تحریک اتحاد بھگتی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔

تحریک تصوف کی تاریخ میں بھگتی تحریک کو اس لیے اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستانی خیالات و معتقدات و مشاغل اور یوگ کے طریقے یعنی حبس دم وغیرہ صوفیوں میں راہ پاگئے قادری سلسلے نے تصوف اسلامی سے ان تمام باتوں کو جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ کلی طور پر نکال باہر کیا ہے۔

تصانیف دین اسلام کی حفاظت و مدافعت کے لیے جناب جیلانی علیہ الرحمہ نے جو کتابیں تصنیف کیں ان کی حیثیت بجا طور پر حصار دین و تحصیل ملت کی ہے آپ کی سب سے پہلی کتاب غنیۃ الطالبین ہے اس میں احکام شرع بیان کیے گئے ہیں اور ان کی توضیح بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے دوسری کتاب فتوح الغیب ہے جس میں آپ نے مضامین تصوف نہایت عالمانہ

انداز میں پیش کئے ہیں تیسری فتح ربانی ہے جس میں آپ کے مواعظ حسنہ و خطبات عالیہ ملتے ہیں۔ انہیں آپ کے نواسے جناب سید عفیف الدین مبارک نے مرتب کیا ہے۔

مکتوب سبحانی اس میں آپ کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو آپ نے وقتاً فوقتاً پند و نصائح کی غرض سے مختلف لوگوں کو لکھے تھے۔

قصائد اس میں آپ کے پُر درد چودہ قصیدہ ہیں اس کے علاوہ آپ کا ایک فارسی دیوان ہے منجملہ ان کے آپ کی کچھ اور کتابیں بھی ہیں جن میں زیادہ تر مشہور وہی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔

ازواج و اولاد آپ نے مختلف اوقات میں چار شادیاں کیں جن سے کل بیس لڑکے اور انتیس لڑکیاں پیدا ہوئیں آپ نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خصوصیت کے ساتھ توجہ فرمائی جس سے آپ کی اولاد نے علم و فضل کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا آپ کے جن بیٹوں سے آپ کی نسل چلی ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ شیخ سیف الدین عبدالوہاب ۲۔ شیخ عبدالرزاق تاج الدین ۳۔ شیخ شرف الدین عیسیٰ ۴۔ شیخ ابو اسحاق ابراہیم ۵۔ شیخ ابوبکر عبدالعزیز ۶۔ شیخ یحییٰ ۷۔ شیخ عبدالجبار ۸۔ شیخ محمد موسیٰ ۹۔ شیخ محمد

خدام و خلفا سلسلہ قادریہ کے خدام خلفا کی تعداد یوں تو ہزاروں تک پہنچتی ہے مگر ان میں سے جن کو اسلام کے پھیلانے میں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ ان میں سے چند ایک مشاہیر کرام کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ شیخ ابوالبقا ابوالحسن علی ۲۔ مفتی عراق قاضی ابو طالب عبدالرحمٰن ۳۔ شیخ امام موفق الدین ۴۔ قاضی ابوالعباس احمد ۵۔ شیخ ابو محمد عبداللہ بن خشاب ۶۔ شیخ قاضی ابو یعلیٰ ۷۔ شیخ ابوالسعود احمد بن ابی بکر حریمی عطار ۸۔ علامہ ابوبکر عبداللہ بن نصر ۹۔ شیخ شہاب الدین سہروردی۔ ان بزرگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے بزرگ ہیں جن کو آپ کے سلسلے سے فیض حاصل ہوا ہے آپ کا قاعدہ تھا کہ اپنے مریدین و خلفاء

کو ممالک اسلامیہ میں مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور دوسرے شہروں میں اسلام کی تبلیغ کے دورے کرتے اور چلتے وقت انہیں حسب ذیل ہدایات فرماتے۔

۱۔ حاکموں اور امیروں کی ملازمت نہ کرنا۔ ۲۔ کسی امیر سے وظیفہ نہ لینا۔ ۳۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی پیروی کرنا۔ ۴۔ شریعت کی حدود سے کبھی آگے نہ بڑھنا۔ ۵۔ زندگی نہایت سادگی سے بسر کرنے کو اپنا شعار بنانا۔

وفات

تبلیغ اسلام اور مدافعت دین کے لیے آپ نے ۵۲۱ھ میں وعظ کہنا شروع کیا جو ۵۶۱ھ یعنی آپ کے انتقال تک چالیس سال برابر جاری رہا اس مدت میں سینکڑوں یہودیوں اور عیسائیوں نے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ ہزاروں مسلمانوں کے ایمان کی تجدید اور عقائد کی اصلاح ہوئی۔ بہت سے شاگرد پیدا کیے جو مشاہیر کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں کئی جماعتیں دیگر ممالک میں اسلام کو پھیلانے کے لیے تیار کیں۔ موصل، حلب، دمشق، تبریز، ہمدان، طوس، بسطامی، الحطیعت اور کوفہ وغیرہ میں قادری سلسلے کے مدرسے قائم ہوئے۔ غرض احیائے اسلام و تبلیغ دین میں کوشش کرتے۔ جب آپ اکیانوے برس کے ہوئے اور آپ کی تمام کوششیں بارآور ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ میں اس دنیائے فانی سے آپ کو واپس بلالیا۔ آپ ۵۶۱ھ میں چند روز صاحب فراش رہ کر راہیٔ دار البقا ہوئے۔ آپ نے بغداد میں وفات پائی۔ وہیں آپ کا مزار پرانوار مرجع خلائق ہے۔

اقوال

۱۔ مالدار بننے کی آرزو نہ کرو۔ بوالہوس مت بنو۔ مالدار اور فقیر و بے نوا کے درمیان امتیاز مت رکھو۔

۲۔ عمل کے بغیر علم مطلق فائدہ نہیں پہنچاتا۔ عامل بنو۔ جان بوجھ کر جاہل نہ بنو۔ عالم باعمل نائب خدا ہے۔

۳۔ اپنے جائز کسب سے کماؤ۔ دین کے ذریعے سے ہرگز نہ کماؤ۔ جائز کماؤ اور کھاؤ اور اس سے دوسروں کی غمخواری بھی کرو۔
۴۔ اللہ سے بندوں کا شکوہ نہ کرو۔ جب تک زندگی کا دروازہ کھلا ہے اسے غنیمت جانو۔
۵۔ ایمان والوں کی آزمائش ہوتی ہے۔
۶۔ خدمت کرو مخدوم بن جاؤ گے۔
۷۔ افسوس اُس شخص پر جس نے قرآن تو حفظ کیا مگر اس پر عمل نہ کیا۔
۸۔ باطن کا جہاد ظاہر کے جہاد سے زیادہ سخت ہے۔
۹۔ دنیا تمھارے ہاتھ میں تو رہے مگر دل پر اس کا قبضہ نہ ہونے پائے۔ دل کو اللہ کی یاد سے آباد کرو۔ اللہ ہی کی محبت کا تمھارے دل پر قبضہ ہو۔

بغداد شریف؟
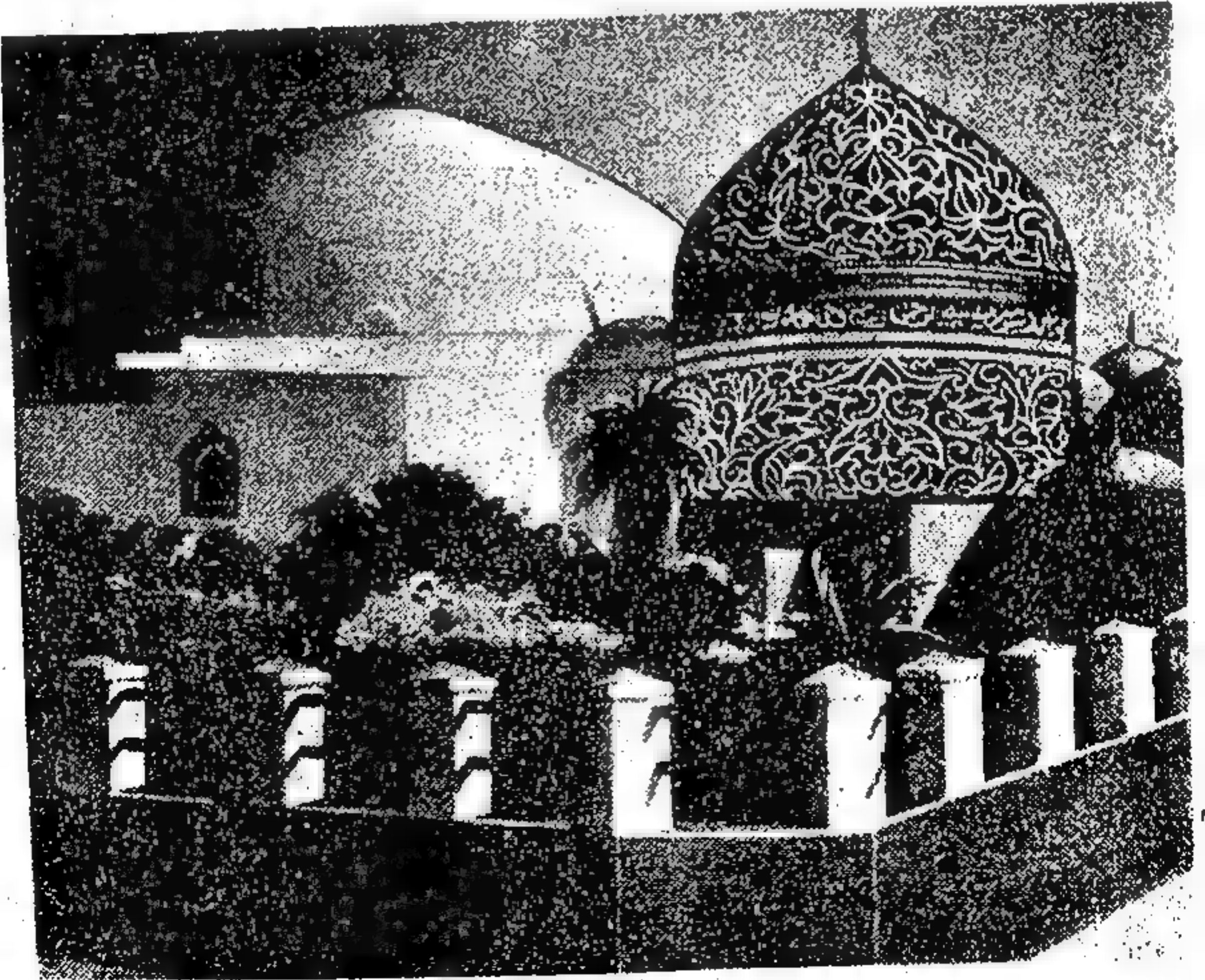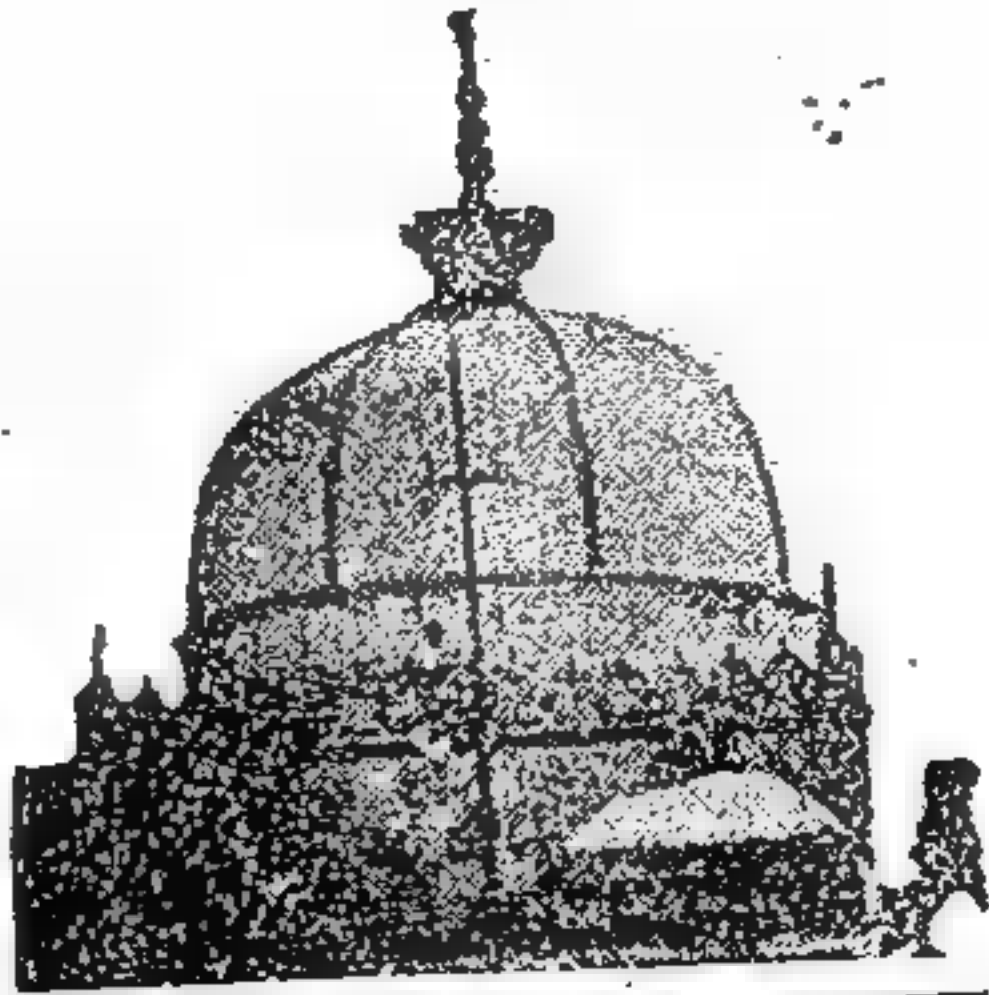
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

ولادت ۵۳۶ھ سیستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم جناب خواجہ سید غیاث الدین ایک خدا رسیدہ اور صاحب اثر و دولت بزرگ تھے۔

آپ کے زمانے میں غز ترکوں نے سلجوقی بادشاہ سلطان سنجر پر حملہ کیا۔ سیستان کا حاکم سنجر کی طرف سے بڑی بے جگری سے لڑا۔ مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ غز ترکوں کے ہاتھ زندہ گرفتار ہوا۔ سلطان سنجر نے راہ فرار اختیار کی۔

غز ترکوں کے حملے سے سیستان میں جو تباہی و بد نظمی پھیلی اس نے خواجہ غیاث الدین کو دل برداشتہ کر دیا۔ وہ سیستان کو چھوڑ کر خراسان آ گئے، جہاں خواجہ معین الدین کی ابتدائی نشوونما ہوئی۔

۵۴۹ھ میں جب خواجہ معین الدین بمشکل تیرہ برس کے ہوں گے۔ انھوں نے غز ترکوں کی ہولناکیوں اور تباہیوں کا نقشہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سلطان سنجر کو غز ترکوں کے مقابلے میں دوبارہ شکست ہوئی اور وہ ان کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ اب

سیستان کو بے دست و پا کر کے ترکوں نے جو آفت مچائی ، خدا کی پناہ ایک ایک کر کے تمام بڑے بڑے آدمی قتل کر دیے گئے ۔ جن میں علماء و فضلاء ، شیوخ اور شہر کے دولت مند لوگ شامل تھے ۔ عورتوں کی عصمت لوٹی گئی ، مسجدوں کو ویران کیا گیا ۔ ان واقعات نے خواجہ معین الدین کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ دنیا سے یکسر بیزار ہو گئے

۵۵۱ھ میں کہ جب خواجہ معین الدین پندرہ برس کے تھے ۔ آپ کے والد محترم انتقال کر گئے ۔ معلوم نہیں آپ کل کتنے بہن بھائی تھے ۔ مگر ترکے کی تقسیم سے پتا چلتا ہے کہ دو چار ضرور ہوں گے ۔ باپ کے ترکہ سے آپ کے حصے میں ایک باغ اور پن چکی ملی تھی جس کو آپ نے اپنی روزی کا ذریعہ بنایا ۔ یعنی آپ خود ہی باغ کی دیکھ بھال کرتے ، پانی پہنچانے اور خود ہی فصل کاٹتے تھے ۔

ایک روز اپنے باغ میں درختوں کو پانی دے رہے تھے کہ ادھر سے ایک عارف کامل اور صاحب علم و عمل بزرگ کا گزر ہوا ۔ آپ نے ان کی بڑی تعظیم کی ۔ ایک سایہ دار درخت کے نیچے لا کے بٹھایا اور ایک تازہ انگوروں کے خوشے سے تواضع کی اور نہایت ادب کے ساتھ دو زانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گئے ۔ یہ بزرگ ابراہیم قندوزی تھے انھوں نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ یہ نوجوان اپنے دل میں حقیقت کو پانے کا جذبہ رکھتا ہے ۔ چنانچہ بقول علامہ اقبال ؒ :

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ابراہیم قندوزی کی ملاقات نے خواجہ معین الدین کے دل پر بہت گہرا اثر کیا ۔ آپ نے باغ اور پن چکی فروخت کر کے اس کی رقم غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دی اور حق کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے ۔

خواجہ خراسان سے چل کر سمرقند و بخارا آئے ۔ یہاں آپ نے قرآن حکیم حفظ کیا ۔ تفسیر ، حدیث و فقہ اور دوسرے علوم دین میں تکمیل حاصل کی اور اس کے بعد نیشاپور کے ایک قصبے ہارون میں آ گئے ۔ یہاں ایک خدا رسیدہ صاحبِ علم و تقویٰ بزرگ شیخ عثمان ہارونی تشریف رکھتے تھے اور ایک خلقِ خدا ان کے فیوض علمی سے فیض پا رہی تھی ۔

خواجہ معین الدین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مرید ہو گئے۔

شیخ عثمان ہارونی تصوف میں چشتی سلسلے کے بزرگ تھے۔ ان کی طریقت کا سلسلہ یوں ہے کہ شیخ عثمان ہارونی چشتی جناب شیخ زندنی چشتی کے مرید تھے۔ زندنی جناب خواجہ مودود چشتی کے مرید تھے۔ مودود چشتی خواجہ ناصر الدین چشتی کے مرید تھے۔

جناب ناصر چشتی، خواجہ محمد اسحاق بانی سلسلہ چشت کے مرید تھے۔ خواجہ محمد اسحاق چونکہ خراسان کے اطراف میں چشت نام ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اسی مناسبت سے چشتی کہلائے اور ان سے آگے جو ارادت مندی کا سلسلہ چلا، یعنی جن بزرگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی انہیں چشتی کہا گیا ہر چند جناب اسحاق شام کے رہنے والے تھے مگر ایک مدت سے یہاں آ رہے تھے ———— اور یہاں برسوں رہ کر اپنے فیوض باطنی سے لوگوں کو فیض پہنچایا اور یہیں مدفون ہوئے اس لیے انھیں چشتی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ یہ بات خواجہ حسن بصری کے بیان میں پیش کی جا چکی ہے کہ تصوف کے کئی ایک سلسلے جو اس وقت رائج ہیں۔ خواجہ حسن بصری ہی کے واسطے سے جناب علی کرم اللہ وجہ، تک پہنچتے ہیں۔ چشتی سلسلہ کا شجرۂ طریقت ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ خواجہ محمد اسحاق بانی سلسلۂ چشت۔ خواجہ ممتاز دینوری کے مرید تھے۔ دینوری خواجہ ہبیرہ بصری کے مرید تھے۔ بصری خواجہ حذیفہ مرعشی کے مرید تھے۔ مرعشی سلطان ابراہیم ادہم کے مرید تھے۔ ادہم فیضل بن عیاض کے مرید تھے۔ عیاض عبدالواحد بن زید کے مرید تھے۔ زید حبیب عجمی کے مرید تھے۔ عجمی جناب خواجہ حسن بصری کے مرید تھے اور حسن بصری جناب علی کرم اللہ وجہ، کے شاگرد اور مرید تھے۔

ہندوستان میں سلسلۂ چشت جناب خواجہ معین الدین چشتی سے پھیلا۔ یہاں پہنچ کر چشتی سلسلے کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک چشتیہ نظامیہ، دوسری چشتیہ صابریہ۔ خواجہ معین الدین اپنے پیر و مرشد سے خرقہ درویشی و سند ولایت حاصل کرنے کے بعد ۵۹۲ کے آخر میں بغداد آئے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ خواجہ معین الدین بغداد میں جناب سید

عبدالقادر جیلانی سے ملے۔ لیکن یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ جیلانی ۵۶۱ھ ماہ ربیع الاوّل کے آخر میں عالم جاودانی کو سدھار چکے تھے۔

لکھا ہے کہ آپ نے شیخ یوسف ہمدانی سے ملاقات کی۔ مگر ہمدانی کا زمانہ بھی بہت پہلے کا ہے۔ وہ جناب عبدالقادر جیلانی کے ابتدائی زمانے میں ہو چکے تھے۔ اس لیے بیان سے بھی یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ خواجہ کی ہمدانی سے ملاقات ہوئی۔

بغداد میں جن بزرگوں نے خواجہ معین الدین چشتی سے اکتساب کیا اور ان سے فیض اٹھایا ان میں جناب شیخ داؤد کرمانی اور شیخ الشیوخ جناب شہاب الدین عمر سہروردی کے نام نمایاں ہیں۔

بغداد سے پھر خواجہ نے ہمدان کی راہ لی۔ یہاں ٹھہرے کچھ دن قیام کرکے اور بزرگان دین کے فیوض باطنی سے فائدہ اٹھا کر پھر تبریز آگئے۔ یہاں شیخ ابوتبریزی سے ملے۔ شیخ تبریزی بڑے خدا رسیدہ اور عارف کامل بزرگ تھے۔ شیخ نظام الدین محبوب الٰہی جیسے بلند مرتبہ بزرگ ان کی پارسائی و علمی فضیلت کے معترف تھے۔

تبریز کے بعد جناب خواجہ اصفہان گئے۔ یہاں جناب خواجہ بختیار کاکی کو آپ سے ملنے کا موقع ملا۔ جناب کاکی آپ کے مرید ہو گئے۔ اصفہان سے چلے تو خرقان پہنچے۔ پھر استرآباد آئے اور یہاں کے مشہور بزرگ جناب شیخ ناصر الدین استرآبادی کے فیوضات باطنی سے استفادہ کیا۔

غرض یہ کہ سیاحت و بادیہ پیمائی میں استرآباد کے بعد ہرات، سبزوار، حصار، بلخ اور غزنین پہنچے۔ غزنین علم و فضل کا مرکز تھا۔ مگر ان دنوں سلطان محمود غزنوی کی اولاد کی حالت بہت پتلی تھی اور غوری خاندان کا ستارۂ اقبال چمک رہا تھا۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ آپ ۵۶۲ھ میں وارد بغداد ہوئے اور ۵۵۸ھ یا ۵۶۰ھ میں غزنین پہنچے۔ بعد کا پتہ نہیں چلتا۔ ۵۶۲ھ میں تو بغداد گئے، پھر وہاں سے مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے غزنین کیسے پہنچ گئے؟

بہرکیف جناب خواجہ غزنین ضرور پہنچے۔ علماء اور حسین غوری نے ان دنوں غزنوی
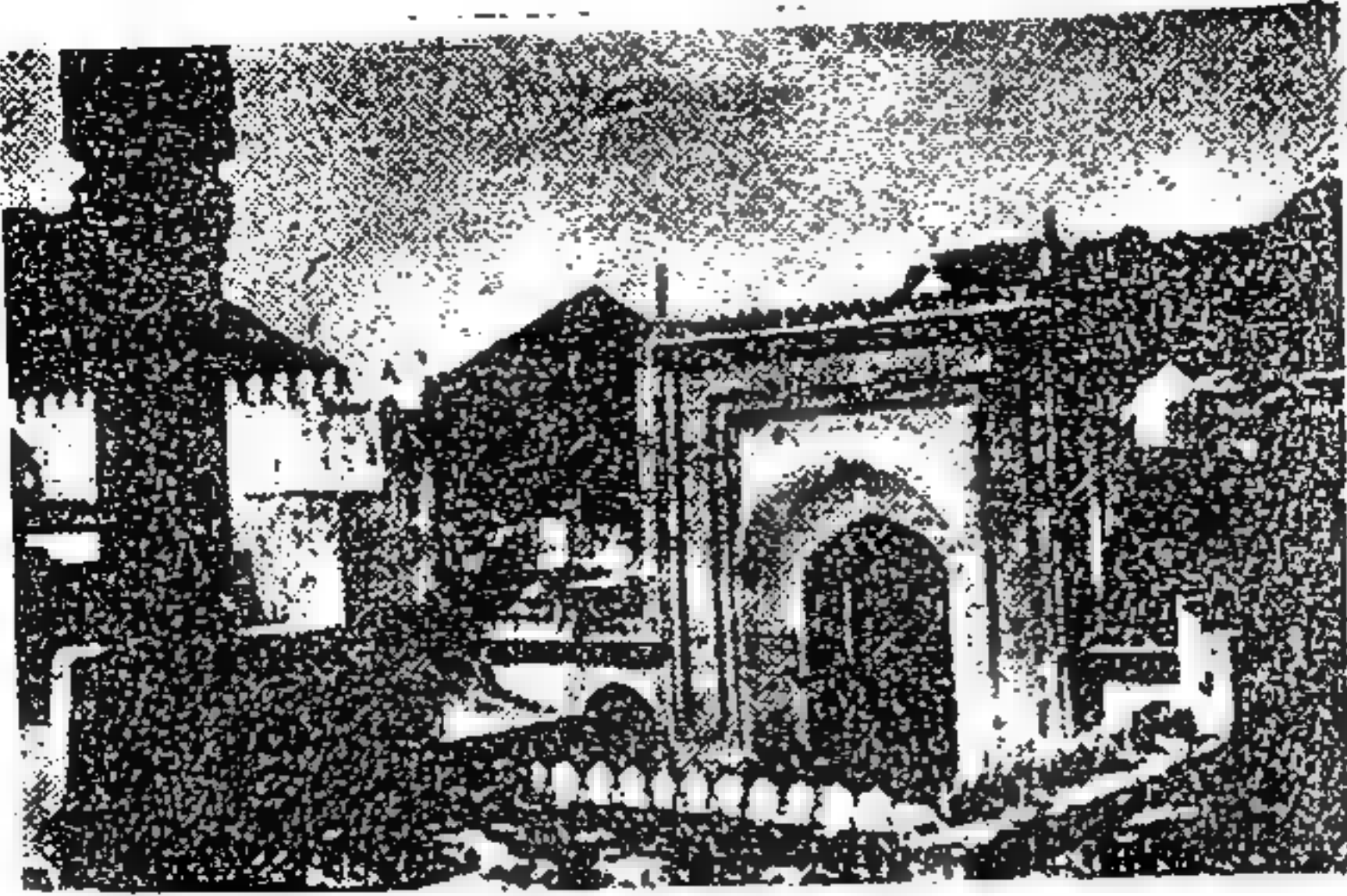
دروازہ
اکبری مسجد
اجمیر شریف

خاندان کے بادشاہ ناصر الدین شاہ کے عہد میں غزنین کا محاصرہ کیا ہوا تھا. لیکن بس دو ہی برس گذرنے پائے تھے کہ ناصر الدین شاہ کے انتقال کے بعد حسین غوری کا بھی انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد حسین غوری کا بیٹا سیف الدین محمد غوری تخت پر بیٹھا بیس برس کا سن بھرپور جوانی مگر شعور پختہ نہیں تھا. سلطنت کو وسیع کرنے کے خیال سے وہ ایک لشکر جرار لے کر ترکان غز کے استیصال کے لئے اٹھا لیکن ایک موقع پر وہ غزوں کو اکیلا ہاتھ آگیا جنہوں نے اسے موقع پاکر مار ڈالا۔

دوسرے سال خود ترکان غز نے پہل کی. مگر ملک شاہ غوری ان کے مقابلہ سے بھاگ کھڑا ہوا اس نے لاہور میں آکر پناہ لی. غزوں نے شہر کو تاخت و تاراج کیا. خوب لوٹ کھسوٹ مچائی، قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اور اس کے بعد غزنیں میں اپنا ایک نائب چھوڑ کر چلے گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد ملک شاہ غزنیں آیا. اس نے ترکان غز کے نائب کو وہاں سے نکالا اور غزنیں پر دوبارہ قبضہ کیا. ظاہر ہے کہ یہ تمام دل دوز واقعات جناب خواجہ معین الدین چشتیؒ کی نگاہوں کے سامنے ہوئے. خواجہ نے دیکھا کہ مسلمان بے عمل ہو چکے ہیں. عیش پرستی و ہوس کوشی نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور یہی ان کی خانہ ویرانی کا سبب ہے. چنانچہ انھوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز کر دیا. اور لوگوں کے ذہن کو جہاد کی طرف پھیرنے کی سعی بلیغ فرمائی۔

غزنین کے بعد آپ نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ ان دنوں یہاں کے رہنے والوں کو جو حالت تھی وہ دنیا بھر کے جاہلوں کے مقابلے میں سب سے بدتر تھی۔

جناب خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے لاہور میں وارد ہوئے اور مخدوم علی ہجویریؒ کے مزار پر چلہ کیا۔ اس کے بعد آپ لاہور سے آگے بڑھے تو دہلی ہوتے ہوئے اجمیر پہنچے۔ ان دنوں شہاب الدین غوری دہلی اور اجمیر کے راجاؤں سے شکست کھا کر گیا تھا اور شکست کا بدلہ لینے کے لیے پھر سے پر تول رہا تھا۔

اجمیر میں اُن دنوں پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ آپ نے وعظ و تلقین کا سلسلہ شروع کیا لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے کہ اللہ والوں کے مزاج میں تلخی نہیں ہوتی وہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے بڑے تحمّل اور نرمی سے کام لیتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے بھی کچھ ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا کہ پرتھوی راج کو آپ سے مطلق کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔

اب ایک خلقِ خدا آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو رہی تھی۔ آپ کا علم و عمل لوگوں کی نگاہ میں اثر پیدا کر رہا تھا۔ لیکن سیاسی احوال یہ تھے کہ شاہان اسلام ہندوستان پر بار بار حملے کر رہے تھے اور فطرتاً مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں بغض و عناد پیدا ہو رہا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ تمام مسلمانوں کو پھر سے ہندو بنا لیا جائے۔ چنانچہ مصلحت ملکی کو سامنے رکھتے ہوئے پرتھوی راج بھی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلاف ہو گیا۔

ایک روز پرتھوی راج نے اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے کہا یہ شخص (خواجہ) جانے لوگوں پر کیا جادو کر رہا ہے کہ لوگ اس کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں اور مسلمان ہو جاتے ہیں مگر ہم پوچھتے ہیں کہ اسے ہمارے ملک میں آنے کا کیا حق ہے؟ کہتے ہیں یہ الفاظ کسی نے جناب خواجہ کو جا سنائے۔ آپ جوش میں آ گئے اور فرمایا: وہ ہمیں یہاں سے نکالے نہ نکالے مگر ہم نے اسے نکال دیا ہے۔

فرشتہ نے لکھا ہے شہاب الدین غوری کے مقابلے میں پہلی جنگ میں پرتھوی راج دو لاکھ سوار لے کر پہنچا تھا۔ دوسری مرتبہ جو لڑائی ہوئی اس میں اس کے پاس تین لاکھ سوار تھے۔ ہندوستان کے تمام راجے اس کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے۔ جو تعداد میں ڈیڑھ سو کے

لگ بھگ تھے اور تین ہزار ہاتھی ہمراہ تھے ترائین کے میدان میں مقابلہ ہوا خوب گھمسان کا رن پڑا۔ بڑے بڑے راجاؤں نے شکست کھائی اور مارے گئے حتیٰ کہ پرتھوی راج نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی مگر دریائے گنگا سے آگے نہیں پہنچنے پایا تھا کہ ایک دلیر آدمی نے تعاقب کر کے گرفتار کر لیا اور شہاب الدین غوری کے حضور میں پیش کر کے اسے ہلاک کر دیا الغرض اس طرح جناب خواجہ کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہو گئی۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں کے دلوں میں جناب خواجہ کی شخصی عظمت اور علمی فضیلت نے پہلے سے زیادہ گھر کر لیا۔ لوگ خود آپ کے دست حق پرست پر اپنی رضا و رغبت سے گروہ در گروہ مسلمان ہو گئے جو لوگ اسلام کو الزام دیتے ہیں تلوار سے پھیلنے کا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ شہاب الدین غوری نے فتح یاب ہونے کے بعد ہندوستان میں اقامت اختیار نہیں کی بلکہ وہ اجمیر میں پرتھوی راج کے بیٹے کو اپنا مطیع و باجگزار بنا کر واپس چلا گیا۔ صرف قطب الدین ایبک جو بعد میں ہندوستان کا شہنشاہ بنا فتح اجمیر کے بعد ہندوستان میں شہاب الدین غوری کا نائب تھا۔ اگر غوری یہاں رہتا تو آج ہندوستان کی حالت کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

ہندوستان میں اسلام پھیلا تو انہی خواجہ معین الدین چشتیؒ جیسے بوریہ نشینوں کے طفیل پھیلا ہے۔ ہر چند شاہان اسلام خواہ کتنے ہی عمدہ مسلمان کیوں نہ ہوں لیکن ان کے بارے میں یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے سرکاری طور پر اسلام کی تبلیغ کی یا عیسائیوں کی طرح مشنری اسکول اور کالج قائم کیے۔ یہ صرف اولیائے کرام ہی کی کوششوں کا حصہ ہے کہ آج پاک و ہند کے بام و در اسلام کے نام سے آشنا ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بیان میں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ جناب سید حسین مشہدی جنھیں خنگ سوار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قطب الدین ایبک نائب ہند کی طرف سے اجمیر کے داروغہ مقرر کیے گئے۔ خنگ سوار نہایت نیک نفس، پاک باطن اور پابند صوم و صلوٰۃ بزرگ تھے لیکن باوجود اثنا عشری شیعہ ہونے کے جناب خواجہ کے ممد و معاون تھے۔ حالانکہ جناب خواجہ شیعہ نہیں تھے۔ لیکن ان کے طرزِ عمل اور حُسنِ
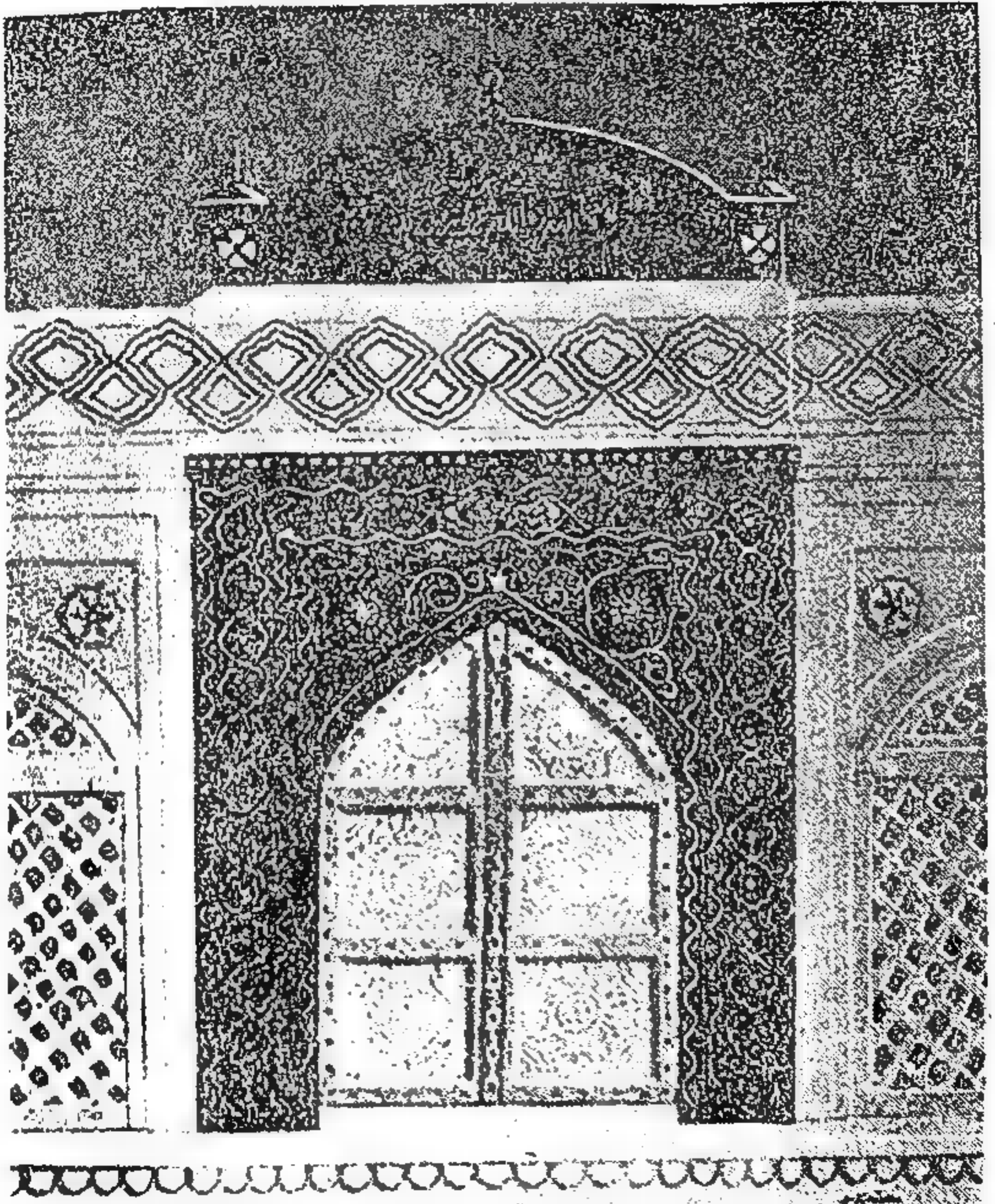
در جنت ہے دروازہ معین الدین چشتی کا

اخلاق نے انھیں اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ خنگ سوار ہر قدم پر خواجہ کے ساتھ رہے جس سے اسلام کی اشاعت کرنے اور خلق خدا کی خدمت کرنے میں بڑی مدد ملی۔

خواجہ معین الدین چشتی نے ہندوستان میں سلسلۂ چشت کو ایسا پھیلایا کہ آج پاک و ہند میں چشتیؒ سلسلے کے بزرگ ہر جگہ موجود ہیں اور ان کے لاکھوں مرید ہیں۔

سیرت العارفین میں لکھا ہے کہ آپ نے ستانوے برس کی عمر میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ۶؍رجب المرجب ۶۳۳ھ ہے۔ آپ اجمیر ہی میں فوت ہوئے، اور یہیں آپ کا مزار پرانوار مرجع خلائق ہے۔

آپ کی تصنیفات کے بارے میں لکھا ہے اگرچہ آپ نے کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ لیکن آپ کے ملفوظات کو جمع کر کے مختلف کتابیں مرتب کر لی گئیں جن میں سے ایک "دلیل العارفین" ہے۔ جسے آپ کے خلیفہ و مرید جناب بختیار کاکی نے مرتب کیا ہے۔

مزار شریف
حضرت
خواجہ
قطب الدین
بختیار کاکیؒ
دہلی
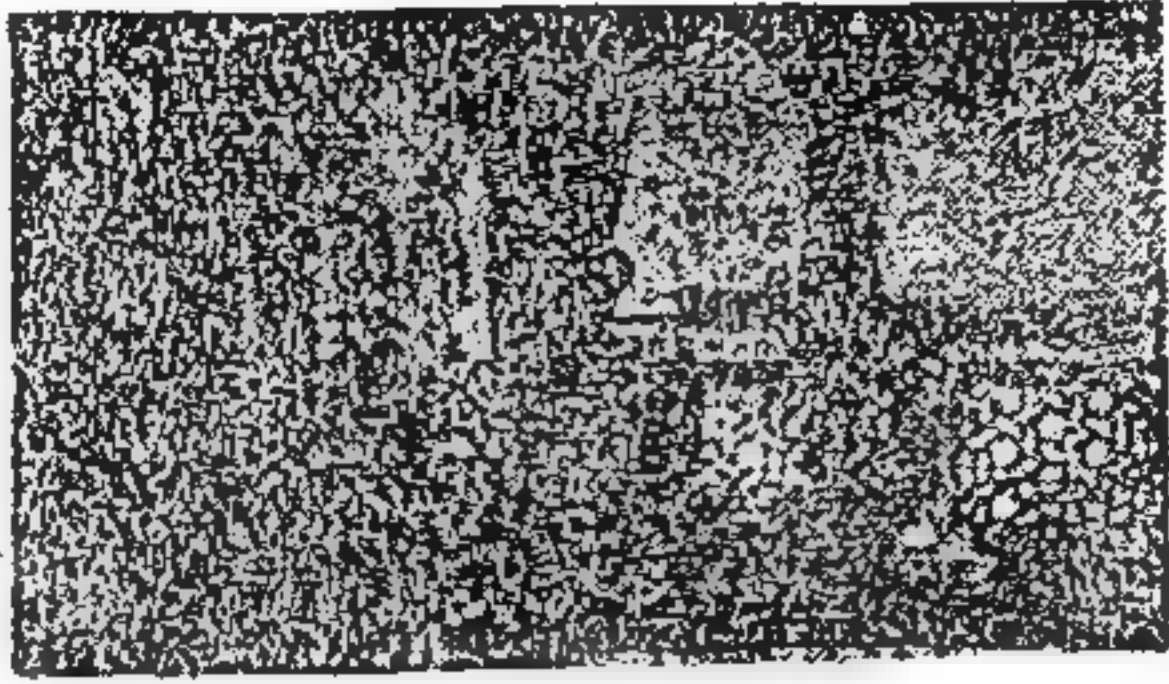
حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ

ولادت ماور النہر میں پیدا ہوئے۔ نام بختیار، قطب الدین لقب، کاکی خطاب تھا۔ شجرۂ نسب یوں ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، ابن کمال الدین بن موسیٰ بن احمد اوشی بن کمال الدین بن محمد بن احمد رضی الدین بن حسام الدین بن رشید الدین بن جعفر بن نقی الوجود بن علی موسیٰ رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن علی زین العابدین بن امام حسین بن حضرت علی کرم وجہہ اللہ۔

کاک کہتے ہیں روٹی کو اس سے متعلق حکایات تو بڑی دلچسپ اور عجیب و غریب ہیں۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کی بیگم صاحبہ سے ایک روز ایک بنیے کی بیوی نے طنزاً کہہ دیا کہ "اگر تمھیں قرض نہ دو تمھارے بچے بھوکوں مرجائیں" آپ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے قرض لینے سے روک دیا اور فرمایا کہ روزانہ حجرے کے طاق سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر جس قدر کاک کی ضرورت ہوا کرے لیا کریں اور بچوں کو کھلا دیا کریں۔ چنانچہ اسی واقعے کی بنا پر آپ کاکی کے نام سے مشہور ہوئے۔

خواجہ بختیار کاکی کا سلسلۂ نسب ۱۴ واسطوں سے جناب امام حسینؓ سے جا ملتا ہے۔

آپ کے والد محترم جناب خواجہ کمال الدین احمد بھی ایک خدارسیدہ بزرگ تھے خواجہ بختیار کاکی ابھی ڈیڑھ سال ہی کے تھے کہ آپ کے والد ماجد انتقال کر گئے ۔ گھر کا تمام بوجھ آپ کی والدہ محترمہ کے کندھوں پر آپڑا۔

ابوحفص نامی ایک باکمال بزرگ سے جناب خواجہ صاحب نے علوم دین حاصل کیے۔ پھر اپنی خداداد لیاقت سے تھوڑے ہی دنوں میں تبحر علمی پیدا کر لیا۔ جب خواجہ معین الدین چشتیؒ پھرتے پھراتے اصفہان آئے۔ تو آپ ان کے مرید ہو گئے اور مرید کیا ہوئے پھر عمر بھر کے لیے انہی کے ہو رہے۔

جب خواجہ معین الدین چشتیؒ واپس آئے تو آپ سے ان کی جدائی گوارا نہ ہو سکی۔ چنانچہ آپ بھی وطن کو خیر آباد کہہ کر ملتان ہوتے ہوئے جناب شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی اور شیخ جلال الدین تبریزی کی مہمانی میں رہ کر اپنے پیر و مرشد جناب خواجہ معین الدین چشتی کی خدمت میں پہنچ گئے۔

سلطان شمس الدین التمش کا عہد حکومت تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ جناب خواجہ بختیار کاکی دہلی تشریف لائے ہیں۔ اسے بزرگوں سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ آپ جنگل سے شہر چلے چلیں اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشیں۔ لیکن آپ نے اس سے عذر کر دیا اور کہا کہ شہر میں پانی کی قلت ہے۔ اس لیے میرے لیے یہی جگہ مناسب ہے۔

سلطان کا قاعدہ تھا کہ ہفتہ میں دو بار ضرور خدمت میں حاضر ہوتا اور اس بات کا طالب رہتا کہ آپ کسی چیز کی فرمائش کریں تو میں لا کر حاضر کر دوں۔ لیکن آپ نے بادشاہ سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیض پاتے آپ کی برکتوں کا یہاں تک اثر ہوا کہ ایک مرتبہ جب خواجہ معین الدین چشتی آپ سے ملنے کے لیے دہلی تشریف لائے اور واپسی میں آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو ہر طرف سے خلقِ خدا جناب خواجہ کی خدمت میں رو رو کر عرض کرنے لگی کہ بابا بختیار کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ انھیں دہلی میں رہنے دیں تو اچھا ہے۔ آخر لوگوں کے اصرار پر آپ کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

مزار حضرت
شاہ التمش
سلطان
نزد
قطب مینار
دہلی
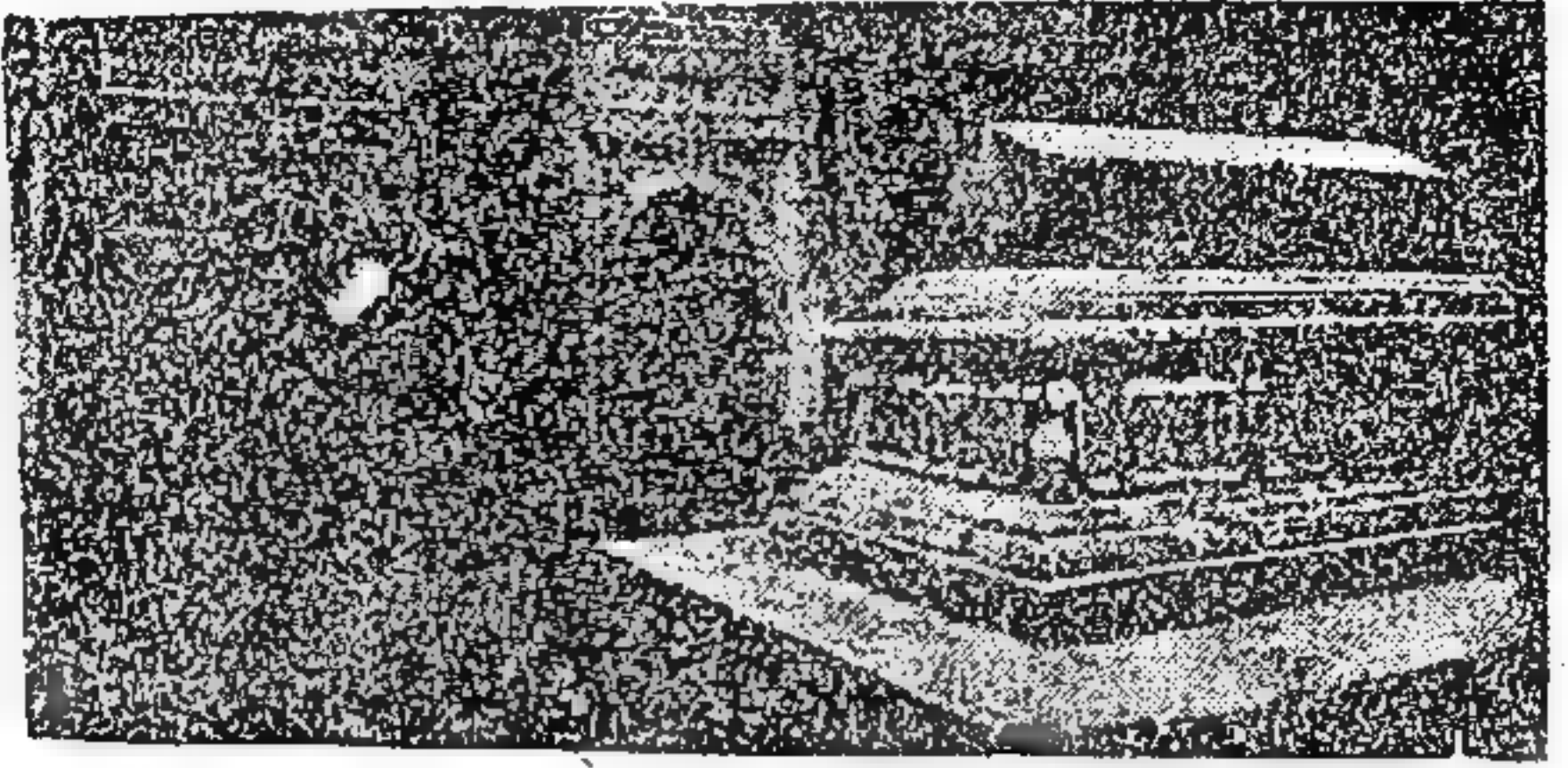
جب شیخ الاسلام مولانا جمال الدین بسطامی کے انتقال پر مرحوم کا عہدہ خالی ہوگیا تو سلطان التمش نے آپ سے درخواست کی کہ شیخ الاسلامی کا منصب قبول فرمالیں۔ آپ نے فرمایا ہم درویشوں کا اس سے کیا تعلق؟

جناب بختیار کاکی کا قاعدہ تھا کہ وہ اوراد و وظائف گوشہ تنہائی میں ادا کرتے تھے اور اپنے مریدوں کو بھی یہی رائے دیتے تھے چنانچہ آپ نے اپنے خلیفہ و مرید جناب شیخ فریدالدین گنج شکر سے بھی یہی فرمایا کہ اوراد و وظائف علیحدگی میں نہ کرنے سے شہرت ہوتی ہے جو ہم فقیروں کے لیے سخت آفت ہے۔

خواجہ بختیار کاکی نے ۶۳۴ھ میں انتقال کیا اور دہلی (مہرولی) ہی میں مدفون ہوئے۔ طبیعت کا عالم یہ تھا کہ باوجود تنگ دست ہونے کے کبھی کسی سائل کو مایوس نہیں جانے دیا۔ لنگر خانے میں جو چیز آتی اسے فوراً فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے اور جس روز کوئی چیز نہ ہوتی تھی خادم سے فرماتے اگر آج لنگر میں کچھ بھی نہیں تو پانی کا دور چلاؤ۔ تقسیم اور عطا و بخشش سے آج کا دن بھی کیوں خالی جائے۔

شان فقر یہ تھی کہ ایک مرتبہ شاہی حاجب اختیارالدین ایبک آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی گاؤں بطور نذر پیش کیے۔ آپ نے فرمایا جس کا دل اللہ کی یاد سے آباد ہو وہ گاؤں لے کر کیا کرے گا۔ چنانچہ آئندہ کے لیے تنبیہ کر کے انہیں واپس کر دیا۔

آپ کے نام سے دو کتابیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک دیوان۔ دوسری فوائد السالکین جن میں آپ کے ملفوظات ہیں اور انھیں آپ کے خلیفہ و مرید جناب فریدالدین گنج شکر نے ترتیب دیا ہے۔

سلطان شمس الدّین التتمش

فوائد السلوک میں لکھا ہے کہ التتمش نہایت صحیح الاعتقاد اور صالح و راسخ العقیدہ شخص تھا۔ وہ راتوں کو جاگتا اور عبادت کرتا۔ تمام عمر اس کو کسی نے سوتے نہیں دیکھا۔ وہ اگر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتا تو جلدی بستر سے اٹھ بیٹھتا۔ عالم تحیّر میں کھڑا رہتا پھر اٹھ کر وضو کرتا اور مصلے پر جا بیٹھتا۔

اپنے ملازموں میں سے رات کے وقت کسی کو نہ جگاتا۔ کہتا کہ آرام کے ساتھ سونے والوں کو اپنے آرام کے لیے کیوں زحمت دی جائے۔ اور خود ہی تمام کام سرانجام دے دیتا۔ وہ رات کو گدڑی پہن لیتا تاکہ اس کو کوئی پہچان نہ سکے۔ ہاتھ میں سونے کا ایک ٹکہ اور توشدان ہوتا۔ وہ ہر مسلمان کے گھر پر جاتا۔ ان کے حالات معلوم کرتا اور ان کی مدد کرتا۔ واپسی میں ویرانوں اور خانقاہوں سے ہوتا ہوا بازاروں میں گشت کرتا اور وہاں کے رہنے والوں کو آسائش پہنچاتا اور پھر ان سے طرح طرح کی معذرت کر کے چپ چاپ چلا جاتا اور ان سے کہہ جاتا اس مدد کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔

دن کو التتمش کے دربار میں عام اجازت تھی کہ جو مسلمان رات کو فاقہ کرتے ہیں وہ اس کے پاس آئیں اور امداد پائیں۔

پھر جب غریب و حاجت مند لوگ اس کے پاس آتے۔ ان کی ہر طرح سے دلجوئی کرتا اور ایک ایک کو قسمیں دے دے کر کہتا کہ دیکھنا فاقہ نہ کرنا۔ تمہیں جب کسی شے کی ضرورت پڑے، مجھ سے آ کر بیان کرو اور اگر کوئی شخص تم سے بے انصافی کرے اور تم پر ظلم و ستم ڈھائے تو یہاں آ کر زنجیر عدل ہلاؤ، تمہاری فریاد سنی جائے گی اور تمہارا انصاف کیا جائے گا۔

پھر لوگوں سے کہتا کہ دیکھو اگر تم مجھ سے آ کر اپنی شکایت نہ کہو گے تو مجھ سے کل قیامت کے دن تمہاری فریاد کا بوجھ نہ اٹھایا جا سکے گا۔
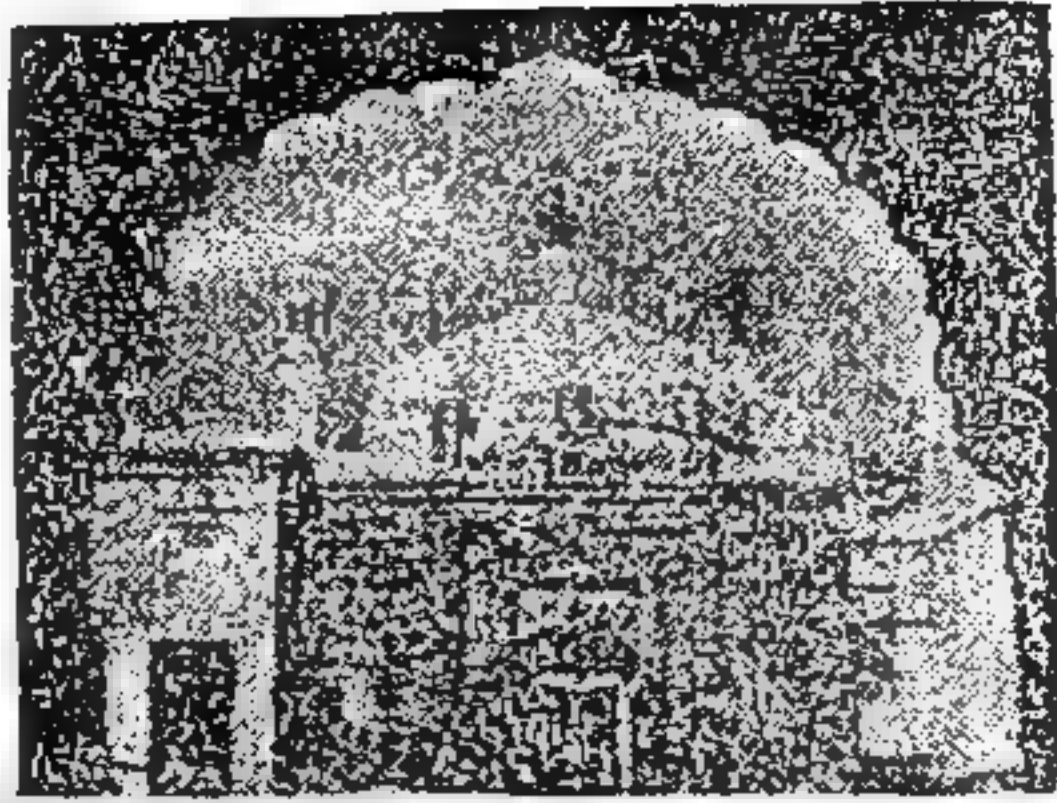
فرید الدین مسعود گنج شکر، فاروقی چشتی

نام: مسعود۔ لقب: فرید الدین۔ عرف: گنج شکر۔

ماں انسان کے لیے درس گاہ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا میں جتنے مشاہیر و برگزیدہ انسان گذرے ہیں اگر ان کی زندگی کے ابتدائی حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی شخصیت کو بنانے اور ان کا مستقبل سنوارنے اور سورج کی طرح روشن کرنے میں سب سے پہلے ان کی ماؤں نے جد و جہد کا آغاز کیا۔

جناب فرید الدین کی والدہ محترمہ بھی انہی میں سے ایک تھیں۔ جن کی تربیت سے ان کے بچے شہرت کے آسمان کے چاند ستارے اور سورج بن کے چمکے۔ جناب فرید الدین کی والدہ کا یہ معمول تھا کہ روزانہ مصلّے کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ دیتیں اور فرمائیں جو بچے نماز پڑھتے ہیں ان کو مصلّے کے نیچے سے شکر کی پڑیا ملتی ہے۔ اس ترکیب کا اثر یہ ہوا کہ جناب فرید الدین بچپن ہی سے نماز کے سخت پابند ہو گئے اور کبھی نماز قضا نہ کرتے تھے غرض اسی مناسبت سے آگے چل کر آپ نے گنج شکر کے نام سے شہرت پائی۔

ولادت : ۵۶۹ھ موضع کوتوال ضلع ملتان میں پیدا ہوئے اور سن بلوغ کو پہنچنے تک یہیں رہے۔ آپ کے والد محترم جناب مولانا کمال الدین سلیمان ساتویں واسطے سے فرخ شاہ بادشاہ کابل کے فرزند اور بیسویں واسطے سے جناب عمر فاروق کی اولاد سے تھے۔ جناب کمال الدین کی والدہ محترمہ سلطان محمود غزنوی کے خاندان سے تھیں۔

فریدالدین گنج شکر کی والدہ محترمہ جناب مولانا وحیدالدین خجندی کی صاحبزادی تھیں۔ مولانا کمال الدین شہاب الدین غوری کے زمانے میں کابل سے لاہور آئے اور کچھ دنوں بعد قصور و ملتان میں تھوڑا سا قیام کر کے موضع کوتوال آرہے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

جناب فرید نے ابتدائی تعلیم کوتوال ہی میں حاصل کی اس کے بعد ملتان آگئے۔ یہاں آپ نے قرآن حکیم حفظ کیا اور عربی کا مروجہ درسی نصاب مکمل کیا۔ انہی دنوں میں جناب خواجہ بختیار کاکی ملتان تشریف لائے۔ آپ کو ان سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔

آپ جناب خواجہ کی خدمت میں پہنچے اور مرید ہوگئے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا میاں فرید جب تک علم حاصل نہیں کروگے، بات نہیں بنے گی۔ جاؤ پہلے علم حاصل کرو۔ پھر میرے پاس آنا۔ جناب فرید اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں اب حصول علم کے لیے بادیہ پیمائی پر مستعد ہوئے، چنانچہ آپ ملتان سے قندھار کو چل دیے۔ پھر وہاں سے بغداد، سیستان و بدخشاں کی خاک چھانتے ہوئے پانچ برس کی مدت میں تمام علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ اسی دوران میں آپ کو جناب شیخ شہاب الدین بانی سلسلہ سہروردیہ سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ شیخ سیف الدین خضری، شیخ سعیدالدین حموی، شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی اور شیخ فریدالدین عطار وغیرہم بزرگان دین سے بھی ملاقاتیں نصیب ہوئیں اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

غرض تکمیل علوم دین کے بعد آپ جناب خواجہ بختیار کاکی کے حضور میں دہلی پہنچے۔ خواجہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور آپ کے لیے غزنین دروازے کے باہر ایک جگہ منتخب کی جہاں آپ ریاضت و مجاہدے میں ہر وقت مشغول رہتے۔

سیر الاقطاب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے متواتر روزے رکھے۔ ایک دن افطاری میں آپ کو کوئی شے میسر نہ آئی۔ ناچار بھوک و پیاس کی حالت میں آپ نے منہ میں چند سنگریزے اُٹھا کر رکھ لیے۔ قدرت خدا کہ وہ شکر کے چند دانے نکلے۔ جناب خواجہ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو فرمایا فرید الدین واقعی گنج شکر ہے۔

خلق خدا آپ کے زہد و عبادت سے بے حد متاثر تھی۔ اکثر آپ کے پاس لوگوں کا اژدھام رہتا تھا۔ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مرادیں لے کر واپس جاتے۔

جناب فرید الدین کو شہرت و نام و نمود سے سخت نفرت تھی۔ جب لوگوں کا ہجوم دن بدن زیادہ ہونے لگا تو آپ دہلی چھوڑ کر جھانسی چلے گئے۔ حتیٰ کہ جناب خواجہ کا انتقال ہوا تو آپ دہلی تشریف لائے۔ پھر چند روز قیام کر کے یہاں سے پاکپتن روانہ ہو گئے

اجودھن جسے ان دنوں پاکپتن کہتے ہیں۔ آپ کے زمانے میں ایسے لوگوں کا مرکز تھا کہ جنہیں فقیروں اور درویشوں کے ساتھ خدا واسطے کا بیر تھا۔ جب آپ یہاں پہنچے اور لوگوں کے طور طریقوں کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ ان لوگوں کے نزدیک درویشوں صوفیوں اور فقیروں کی کوئی وقعت نہیں تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا کہ ہم فقیروں کے رہنے کے لیے یہی جگہ سب سے موزوں ہے۔

چنانچہ آپ نے آبادی سے تھوڑی دُور جنگل میں ایک درخت کے نیچے اپنا کمبل بچھا لیا۔ اور اللہ کی یاد میں محو ہو کر بیٹھ گئے۔ رفتہ رفتہ آپ کے باطن کی برکتیں لوگوں پر ظاہر ہونے لگیں۔ لوگ جوق در جوق آپ کے پاس آنے لگے۔

جب آپ کے مرید و معتقدین میں کافی حد تک اضافہ ہو گیا تو آپ نے اپنے بیوی بچوں کے لیے شہر کی جامع مسجد کے قریب ہی ایک مکان بنا لیا۔ جہاں آپ کے اہل و عیال نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مگر آپ خود اسی درخت کے نیچے رہتے اور وہیں رات بسر کرتے تھے۔

کہتے ہیں آپ کے پاس فقط ایک ہی کمبل تھا جسے دن میں بچھا کر بیٹھ جاتے رات کو وہی اوڑھ کر سو جاتے۔ کمبل اتنا چھوٹا تھا کہ آپ کے پیر پورے طور پر پھیل نہ سکتے تھے

ایک لکڑی کا تکیہ تھا جس کا سرہانہ بناتے اور ایک عصا تھا جو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے تبرکات سے آپ کو پہنچا تھا۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کا بادشاہ ناصر الدین محمود آپ کی زیارت کے لیے دہلی سے پاکپتن آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اللہ والوں کی ملاقات میں یقیناً ایک روحانی کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اور انسان ان کے قرب سے طمانیت قلب محسوس کرتا ہے۔ سلطان ناصر الدین محمود آپ سے مل کر بے حد متاثر ہوا۔ چنانچہ واپس دہلی پہنچ کر اپنے وزیر الغ خان کے ہاتھ پانچ گاؤں اور ایک بہت بڑی رقم آپ کی خدمت میں نذرانے کے طور پر ارسال کی۔

آپ نے الغ خاں سے (جو بعد میں سلطان بلبن کے نام سے مشہور ہوا) فرمایا ہم فقیروں کو ان چیزوں سے کیا واسطہ؟ یہ انھیں کو دے کر دو جو اس کے ضرورت مند ہیں۔

سلطان غیاث الدین بلبن شہنشاہ ہند کی دختر نیک اختر آپ کے عقد میں تھیں اور ان کے بطن سے آپ کے چھ بیٹے ہوئے۔ رشتہ کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ آپ کا سلطان سے کتنا مضبوط تعلق تھا۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت مند نے سلطان کے دربار میں آپ سے ایک سفارش کرائی۔

آپ نے سلطان کے نام ان الفاظ میں سفارشی رقعہ لکھا:

"میں نے اس شخص کا معاملہ پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر دیا ہے۔ اب اگر آپ اس کا کام کر دیں، کام تو اللہ تعالیٰ ہی کرے گا مگر شکریہ آپ کے حصے میں آئے گا بصورت دیگر میں سمجھوں گا کہ خدا کو نہیں منظور اس لیے آپ کا اس میں کیا قصور؟"

جناب نظام الدین محبوب الٰہی لکھتے ہیں کہ حضرت فرید الدین گنج کا عہد ولایت خیر الاعصار ہے۔ کیونکہ آپ کے زمانے میں کافی مشائخ عظام جمع ہو گئے تھے۔

محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ جناب شیخ زکریا بہاؤ الدین ملتانی، شیخ سیف الدین حضری اور جناب شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر ایک ہی زمانے میں ہوئے اور تینوں یکے بعد دیگرے تین سال بعد فوت ہوئے ہیں۔

جناب فرید الدین مسعود گنج شکر نے ۶۶۴ھ میں انتقال فرمایا۔ پاک پٹن ہی میں مدفون ہوئے۔ جہاں ہر سال محرم کے مہینے میں آپ کا عرس ہوتا ہے۔

آپ کی تصنیفات وہ ملفوظات ہیں جن کو آپ کے داماد و مرید جناب نظام الدین محبوب الٰہی نے مرتب کیا ہے۔ ایک کا نام ہے راحت القلوب، دوسری کتاب کا نام ہے سیرۃ الاولیا۔ سیرۃ الاولیاء کو آپ کے ایک خلیفہ و مرید جناب بدر اسحاق نے مرتب کیا ہے۔

کہتے ہیں آپ روزانہ روزہ رکھتے سخت ریاضت و محنت کرتے۔ فراغت پا کر غسل کرتے اور نماز پڑھتے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر نماز غسل کر کے ادا کرتے تھے مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ سخت محنت و مشقت کے باوجود آپ کی صحت ہمیشہ عمدہ رہی۔

ایک مرتبہ ایک درویش ملاں یوسف نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ جناب مولانا نظام الدین دہلوی تو چند روز آپ کی خدمت میں رہے اور فیوض باطنی سے مالا مال ہو کر بھی چلے گئے ایک میں ہوں کہ برسوں سے آپ کی خدمت میں پڑا ہوں۔ مگر آپ کے فیوض باطنی سے یکسر محروم ہوں۔

یہ شکایت سن کر آپ نے ایک چھوٹے سے بچے کو بلایا اور اس سے کہا بیٹا! وہ سامنے جو اینٹیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہمارے لیے ایک اینٹ لے آؤ۔ وہ بچہ گیا اور آپ کے لیے ایک عمدہ سی اینٹ لے آیا۔ پھر آپ نے اس سے کہا اچھا اب ایک اینٹ مولانا نظام الدین کے لیے بھی لے آؤ۔ وہ بچہ پھر گیا اور ایک عمدہ سی اینٹ اور لے آیا۔ اس کے بعد آپ نے پھر فرمایا۔ اچھا اب ایک اینٹ ملاں یوسف کے لیے بھی لے آؤ۔ پھر گیا اور ایک اینٹ اٹھا لایا۔ مگر اب کے جو اینٹ لایا وہ اینٹ کا ایک بے ڈھنگا سا ٹکڑہ تھا۔ آپ نے ملاں یوسف سے کہا اس میں میری کچھ کوتاہی نہیں۔ یہ تمہاری ناقابلیت کا نتیجہ ہے اور قسمت کی بات ہے ورنہ میرے لیے تو سب برابر ہیں۔

آپ بات بات میں ایسے لاجواب نکتے بیان فرماتے تھے کہ اگر یورپ کے وہ لوگ ان کو دیکھ لیں تو یورپ کے فلاسفروں کو بھول جائیں۔ آپ کے اقوال میں ان لوگوں کو جو زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں زندگی مل جاتی ہے۔

اقوال

(۱) نامرادی کا دن مردوں کی شب معراج ہے (۲) سبک ساری کی خواہش کمزوری کی علامت ہے۔ (۳) جیسا تو ہے ویسا ہی لوگوں کو دکھا ورنہ اصلیت خود بخود کھل جائے گی۔ (۴) احمق کو زندہ خیال نہ کر۔ (۵) وہ شے جو خریدی نہ جاتی ہو اسے فروخت نہ کرو۔ (۶) ہر کسی کی روٹی نہ کھاؤ مگر ہر شخص کو اپنی روٹی کھلاؤ۔ (۷) گناہ پر فخر نہ کرو آرائش کے پیچھے نہ پڑو۔ (۸) جس چیز کی کوشش کرو اس سے ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ (۹) جو تم سے ڈرے اس سے ہر وقت اندیشہ کرو۔ (۱۰) دروغ نما راستی کو ترک کرو۔ (۱۱) قاتل نما بے وقوف سے پرہیز کرو۔ (۱۲) وقت کا کوئی بدل نہیں۔ (۱۳) ہنر ذلت سے سیکھ یعنی تحصیل علم و ہنر میں کسی ذلت کا خیال نہ کرو۔ (۱۴) دشمن کی دشمنی اس سے مشورہ کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ (۱۵) کوئی مصیبت خدا کی طرف سے آئے اس سے ہراساں نہ ہو۔ (۱۶) اگر ہے کچھ تو غم نہیں اگر نہیں ہے تو بھی غم نہیں۔ (۱۷) درویشوں کے لیے فاقہ سے مرنا لذت نفس کے لیے قرض لینے سے بہتر ہے۔ (۱۸) دو آدمیوں کا مباحثہ ایک آدمی کے اکیلے سوچنے کی دو سالہ محنت سے زیادہ مفید ہے۔

آپ کی جسمانی و روحانی اولاد تو بے شمار ہے مگر یہاں ہم صرف اتنا بتانے پر اکتفا کریں گے کہ آپ کے خلیفہ اول جناب قطب جمال الدین ہانسوی ہیں۔ دوم جناب مولانا نظام الدین محبوب الٰہی جن سے سلسلۂ نظامیہ چشتیہ چلا۔ سوم جناب مخدوم علاء الدین کلیر صابری ہیں، جن سے چشتیہ صابریہ کا سلسلہ منسوب ہے۔

مزارِ پُرانوار حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ (پاک پتن شریف)
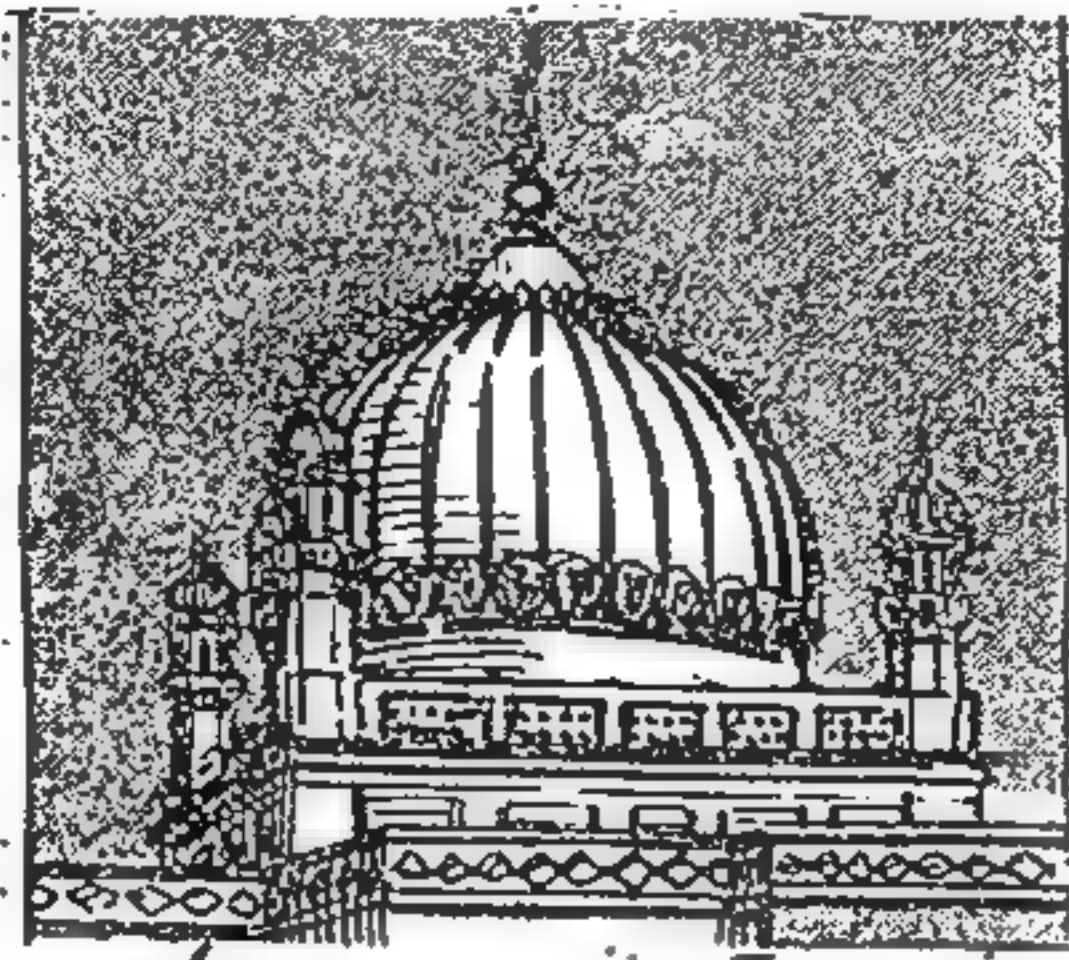
حضرت مخدوم صابر کلیریؒ

جناب مخدوم صابر کلیری کے مختصر سوانح حیات یہ ہیں:۔

ولادت ۵۹۲ھ کو توال ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم جناب سید عبدالقادر جیلانی کے پوتے اور آپ کی والدہ محترمہ جناب فریدالدین مسعود گنج شکر کی حقیقی بہن تھیں۔

آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد آٹھ سال کی عمر میں آپ اپنے ماموں جان کی خدمت میں پاکپتن آ گئے۔ ۶۰۲ ہجری میں ان سے بیعت کی۔

جناب مخدوم کلیری اپنے ماموں کے لنگر کے انچارج تھے۔ فقیروں، درویشوں اور دوسرے حاجت مندوں میں آپ ہی کھانا تقسیم کیا کرتے تھے۔ سب کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے مگر خود بھوکے رہتے تھے۔ اسی رعایت سے آپ کو جناب فریدالدین نے صابر فرمایا جو آگے چل کر آپ کی شہرت کا سبب ہوا۔

جب علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کر چکے تو آپ کو دین اسلام کی تبلیغ اور علوم دین کی اشاعت کے لیے جناب فریدؒ نے شہر فیض بخش کلیر کو جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ پاکپتن

سے کلیر تشریف لے گئے اور وہاں پہنچ کر اپنے فرض منصبی کو ادا کرنا شروع کر دیا۔

ابھی کلیر میں آئے ہوئے آپ کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ آپ کے کمالات علمی کی ہر طرف دھوم مچ گئی۔ ایک خلق خدا آپ سے فیض پانے لگی۔

ایک مرتبہ آپ جمعۃ المبارک کی نماز ادا کرنے کے لیئے اپنے درویشوں کے ساتھ شہر کی جامع مسجد میں گئے اور اس پہلی صف میں جا کر بیٹھ گئے جو شہر کے معززین کے لیے مخصوص تھی۔ جب شہر کے امراء و مشائخ آئے اور انھوں نے اپنی جگہ نہ پائی تو انھوں نے آپ اور آپ کے درویشوں سے تعرض کیا اور سختی سے کہا کہ یہ ہمارے بیٹھنے کی جگہ ہے، یہاں سے اٹھ جاؤ۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں امیر و غریب، شاہ و گدا سب برابر ہیں۔ ان کا تعرض کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی انھیں اپنی گرفت میں لے لیا۔

کہتے ہیں شہر کی جامع مسجد گر گئی اور ہزاروں آدمی اس کے نیچے دب کے مر گئے اور شہر تمام کا تمام برباد ہو گیا۔ طاعون کی ایسی بیماری پڑی کہ بارہ بارہ کوس تک کوئی چرند پرند، حیوان اور انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

آپ کی طبیعت میں جلال بہت زیادہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ آپ کے رعب و داب سے متعلق لوگوں نے طرح طرح کے قصے پھیلا رکھے ہیں۔ ہمیں ان قصوں سے مطلق غرض نہیں ہمارے نزدیک تو قابل ستائش کا پہلو تو یہ ہے کہ آپ خلاف شریعت نہ خود چلتے اور نہ دوسروں کو چلتا دیکھ سکتے تھے بلکہ احکام اسلام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سختی سے ڈانٹتے تھے۔ جب شہر کلیر برباد ہوا ہے تو اس کے بعد لوگوں پر آپ کی روحانی قوت کی اتنی ہیبت چھا گئی کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے انھیں خوف آتا تھا۔

آپ کے خلفاء میں جناب شیخ شمس الدین ترک پانی پتی آپ کے ممتاز خلیفہ ہیں۔ وہ آپ کی خدمت میں کامل بتیس ۳۲ برس تک رہے اور کبھی آپ سے جدا نہیں ہوئے۔ جب ترک پانی پتی آپ سے روحانی تحصیل کر چکے تو آپ نے انھیں حکم دیا کہ جاؤ سواروں میں جا کر ملازم ہو جاؤ اور دیکھو جس روز تمھاری کوئی دعا کسی کے حق میں قبول ہو جائے تو

سمجھ لینا کہ میں دُنیا سے چلا گیا. چنانچہ ترک پانی پتی مرشد کے حکم سے شاہی فوج میں نوکر ہو گئے اور سلطان علاء الدین خلجی کے ساتھ چتوڑ گڑھ کی مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ ہوئے.
سلطان نے بڑی کوشش کی اور ایک طویل عرصے تک قلعہ کا محاصرہ کیے رکھا. مگر قلعہ فتح نہ ہوا. اسی دوران میں ایک روز رات کو ایسی آندھی چلی کہ تمام لشکر کے چراغ چٹ ہو گئے مگر ایک چراغ جل رہا تھا جسے دیکھ کر سلطان کو بڑا تعجب ہوا. سلطان معلوم کرنے کے لیے آگے بڑھا. اس نے دیکھا کہ ایک شخص خیمے میں بیٹھا. قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا ہے اور اس شدید آندھی کے آنے کے باوجود چراغ جل رہا ہے. وہ یہ ماجرا دیکھ کر چپ چاپ موؤب کھڑا رہا. جب ترک پانی پتی قرآن حکیم کی تلاوت سے فارغ ہوئے تو سلطان کو باہر کھڑا دیکھ کر جلدی سے اس کی تعظیم کے لیے آگے بڑھے اور پوچھا کہ حضور نے اس وقت کیسے زحمت فرمائی. سلطان نے کہا میرا قصور معاف کر دیجیے اور اللہ کی بارگاہ میں دعا کیجیے کہ قلعہ فتح ہو جائے. آپ نے یہ سُن کر کہا کہ میں تو آپ کی فوج کا ایک ادنیٰ سا ملازم ہوں. مجھے ایسی مقبولیت کہاں نصیب ہے جو میری دعا قبول ہو جائے. آپ کو شاید کسی نے بہکا دیا ہوگا. سلطان نے اصرار کیا، کہا نہیں ایسا نہ کہیے. آپ دعا کیجیے. اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائے گا. چنانچہ ترک پانی پتی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے. اللہ نے دعا قبول کر لی. قلعہ فتح ہو گیا.

قدرت خدا جناب مخدوم کلیری کی بات پوری ہوئی. جس روز ترک پانی پتی کی دعا قبول ہوئی. اسی روز جناب مخدوم کلیری کا انتقال ہو گیا. ترک پانی پتی کے دل نے اس واقعہ ناگزیر کی گواہی دی. چنانچہ وہ کلیر پہنچے اور اپنے مرشد کے تجہیز و تکفین کے فرض کو انجام دیا.

جناب مخدوم علاء الدین کلیری صابری نے ۶۹۰ھ میں انتقال فرمایا آپ کا مزار کلیر ضلع سہارنپور میں نہر گنگ کے کنارے پر واقع ہے.

شہنشاہ نور الدین جہانگیر نے اپنے عہد حکومت میں آپ کے مزار کا گنبد تعمیر کرایا تھا. آپ کے مزار پر ہر سال عرس ہوتا ہے. تمام مذاہب کے لوگ بلا امتیاز و تخصیص کے اس

میں شامل ہوتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے آپ کے عرس کی ایک کیفیت لکھی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ سے چودہ[۱۴] تک جناب مخدوم کلیری کا عرس ہوتا ہے، جس میں دو لاکھ کے قریب مجمع ہوتا ہے۔ صابریہ سلسلے کے تمام مشائخ اور ان کی خانقاہوں کے سجادہ نشین اس میں شامل ہوتے ہیں۔ نذر و نیاز اور لنگر کے طعام کے لیے کم سے کم پانچ لاکھ روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ یہ رقم وہ ہے جو سال بھر تک ہر درویش اپنے مریدین سے لنگر کے خرچ کے لیے نذر و نیاز قبول کر کے جمع کرتا ہے اور عرس کے موقع پر یہاں لا کر خرچ کر دیتا ہے۔

سینکڑوں بنیے گھی، قند اور چاول وغیرہ مسلمان زائرین کے ہاتھ فروخت کر کے چند ہی دنوں میں مالا مال ہو جاتے ہیں۔ تقسیم طعام کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ہر فقیر کے پاس بریانی کے چاولوں اور خمیری روٹیوں کا ایک انبار لگ جاتا ہے، جہاں تک وہ کھا سکتے ہیں کھاتے ہیں جو خشک ہو سکتا ہے اس کو سکھا کر بطور تبرک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

صابریہ سلسلے کے بعض بعض مشائخ ایسے بھی آتے ہیں جو ہزار ہزار روپے کا کھانا پکوا کر فقیروں اور غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ حلوے اور مٹھائیوں پر نیاز دلواتے ہیں۔

غرض عرس کی دھوم دھام کہاں تک بیان کریں۔ یہ موقع دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے سماع کی محفلیں، فاتحہ خوانی اور ذکر و شغل کے حلقے، حال و قال اور وعظ و نصیحت کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔

بستی نظام الدین رحؒ دہلی کا ایک منظر
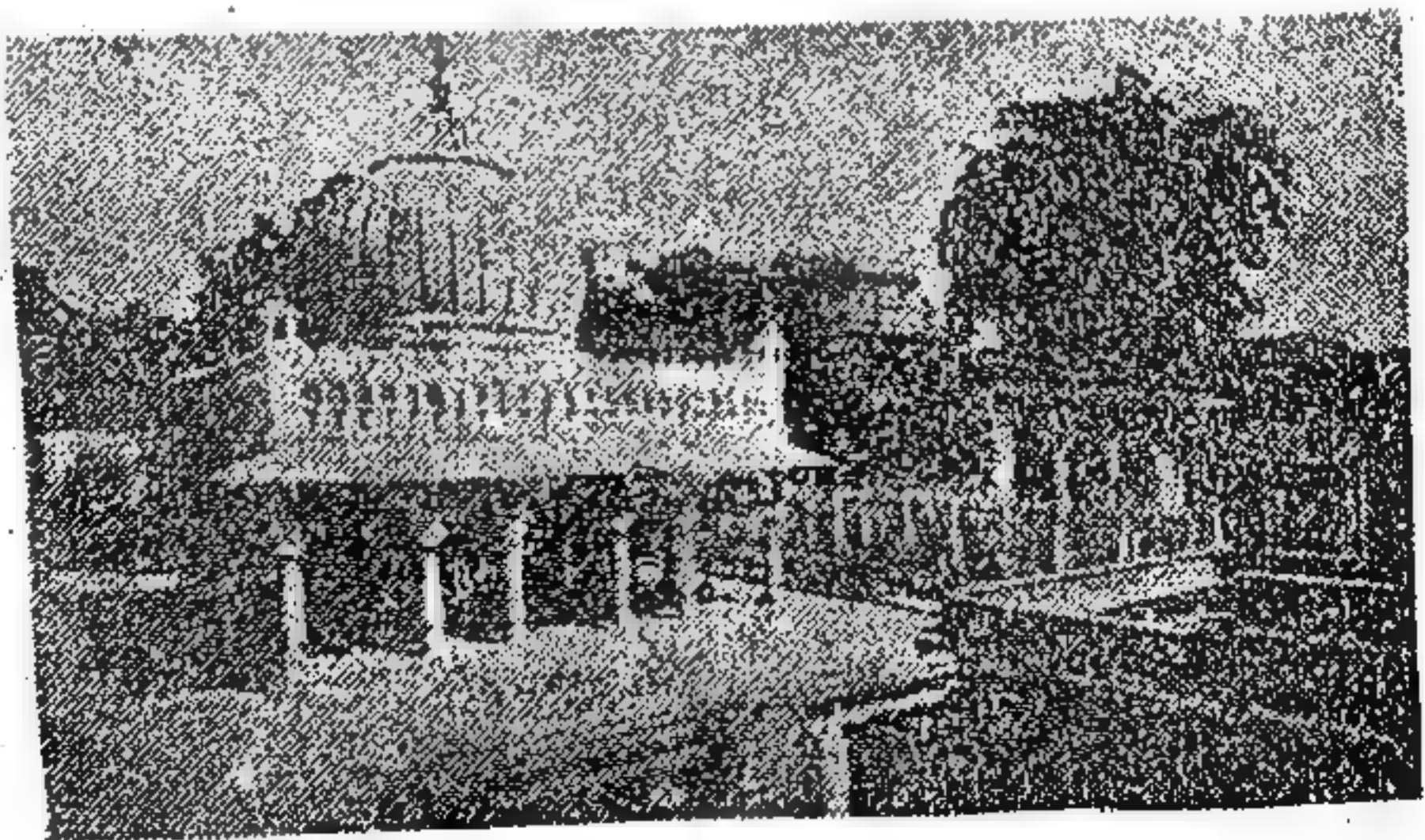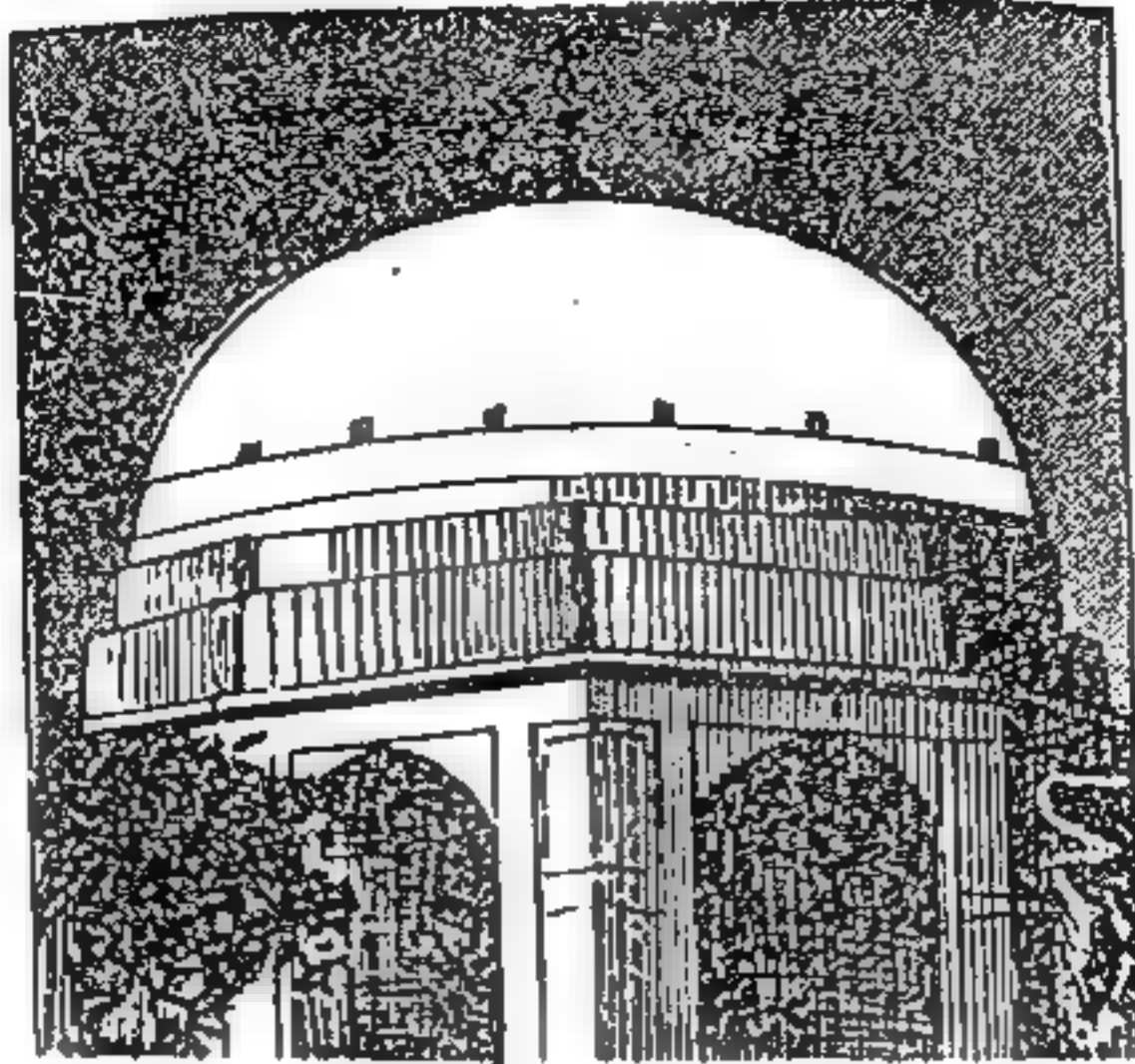
حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ

۵۷۸ھ ملتان میں پیدا ہوئے۔

ولادت

آپ کے باپ دادا چنگیز خاں کے زمانے میں خوارزم سے نکل کر ملتان آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔

آپ کے جدِ اعلیٰ کمال الدین علی شاہ مکہ معظمہ سے نکل کر خوارزم میں آباد ہوئے۔ جہاں شیخ وجیہ الدین پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب ہبار بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ ابن قصئ قریشی سے جا ملتا ہے۔

شیخ وجیہہ الدین کی شادی مولانا حسام الدین ترمذی ایک ممتاز بزرگ کی بیٹی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے جناب غوث بہاء الدین زکریا ملتانی تولد ہوئے۔

آپ کو پانچ برس کی عمر ہی سے تعلیم دین کی طرف راغب کیا گیا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ بارہ برس کی عمر کو پہنچنے تک آپ کو اتنی تحصیل علم ہو گئی تھی کہ جتنی کوئی صاحبِ شعور سات برس کی مدت میں حاصل کر سکتا ہے۔

آپ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے تھے کہ آپ کی والدہ محترمہ انتقال فرما گئیں اور عین

عالمِ جوانی میں آپ کے والدِ محترم انتقال فرما گئے۔
والدِ محترم کے بعد چونکہ ان کے سر پر کسی مشفق بزرگ کا سایہ نہ رہا۔ اس لیے وہ حصولِ تعلیم کے لیے ملتان سے خراسان چلے گئے اور یہاں کے علماء فضلاء سے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پھر بخارا چلے گئے۔ وہاں نہ صرف تحصیل علوم ظاہری کی بلکہ اجتہاد کا درجہ پا لیا۔
پھر بخارا سے مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ یہاں پانچ برس تک مجاوری کرتے رہے۔ یہاں سے مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ شیخ کمال الدین محمد یمنی سے علم حدیث حاصل کیا۔
پھر بیت المقدس پہنچے۔ شیوخ سے ملے۔ یہاں سے چل کر پھر بغداد آ رہے اور جناب شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے فیض صحبت اٹھایا۔ ان سے علوم باطنی حاصل کیے اور خرقہ خلافت پایا۔
کہتے ہیں جناب شیخ شہاب الدین سہروردی کے درویشوں نے یہ دیکھ کر کہ زکریا ملتانی کو صرف سترہ دن جناب شیخ کی خدمت میں رہنے سے خرقہ خلافت مل گیا۔ آپس میں کھسر پھسر کی۔ کہنے لگے کہ ہم اتنی مدت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہیں ہمیں تو خرقہ خلافت عطا نہیں ہوا مگر یہ ہندی درویش چند ہی دنوں کی حاضری سے خرقہ خلافت لے کر چلتا بنا۔ کہتے ہیں یہ بات کہیں ہوتے ہوتے جناب شیخ تک پہنچ گئی۔ آپ نے فرمایا۔ اے درویشو! تم لوگ تر اور سبز لکڑی کی طرح ہو اور زکریا ملتانی خشک لکڑی کی مانند ہے۔ جس تیزی و سرعت کے ساتھ سوکھی لکڑی آگ پکڑتی ہے تر لکڑی نہیں پکڑ سکتی۔ در یہ بات سن کر ندامت محسوس کی اور خاموش ہو رہے۔
جناب زکریا خرقہ خلافت پانے کے بعد اپنے مرشد کے حکم سے ملتان واپس آ گئے اور یہاں پہنچ کر آپ نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا۔ آپ کے ایک پیر بھائی جناب شمس الدین تبریزی جو آپ سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ تبلیغ اسلام میں آپ کے ممد و معاون بن گئے۔
جناب زکریا نے ملتان میں دین اسلام کی تعلیم کے لیے سب سے پہلے ایک مدرسہ قائم کیا جس کے اثر سے ملتان میں اسلامی زندگی ظہور میں آئی اور لوگوں کے دلوں میں خدا کی یاد رہنے لگی۔ اس کے بعد آپ کی طبیعت کی فیاضی اور دل کی سخاوت نے خلق خدا کو

ولایت کا مفہوم سمجھانا شروع کیا۔ چنانچہ کہتے ہیں ایک مرتبہ آپ کے ایک مرید جناب خواجہ کمال الدین مسعود شیروانی جو ہیرے جواہرات کی تجارت کیا کرتے تھے، دیگر سوداگروں کے ساتھ بحری جہاز میں سوار تھے۔ جب جہاز عدن کے لیے روانہ ہوا تو ابھی تھوڑی ہی دور پہنچا تھا کہ باد مخالف چلنے لگی اور جہاز کے مسافر گھبرا گئے۔

یہاں تک کہ ان میں سے کسی کو بچنے کی امید نہ رہی۔ ایسے عالم حسرت و یاس میں خواجہ کمال الدین نے خدا کی بارگاہ میں فریاد کی اور تمام تاجروں نے اپنے دل میں کہا کہ اے پروردگار! اگر ہم اس عذاب اور طوفان میں تیرے فضل و کرم سے صحیح و سالم پار اتر گئے تو ہم تیری راہ میں اپنے مال و اسباب کا تیسرا حصہ خیرات کریں گے۔

کہتے ہیں خواجہ کمال الدین و دیگر تاجروں کی نگاہوں کو یوں محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے گویا جناب زکریا ملتانی کو جہاز والوں کی مدد کے لیے بھیج دیا اور قدرت خدا جہاز بخیر و عافیت عدن پہنچ گیا۔

اب تمام سوداگروں نے اپنے مال و اسباب کا تیسرا حصہ خواجہ کمال الدین کے حوالے کیا اور خواجہ نے فخر الدین گیلانی کے ہاتھ جناب زکریا ملتانی کے پاس بھیج دیا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ یہ رقم ستر لاکھ روپے تھی۔

جناب زکریا ملتانی نے اس رقم کو قبول کر کے اسی وقت شہر کے تمام غریبوں، یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کر دیا اور خود اس سے دامن جھاڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ کہتے ہیں اس واقعہ سے تمام ملتان میں آپ کی سخاوت و فراخدلی کی دھوم مچ گئی اور آپ نے لوگوں پہ عملاً ثابت کر دکھایا کہ جن خوش نصیبوں کو خدا مل جاتا ہے انھیں پھر کسی شے کی حاجت نہیں رہتی جو خدا کے قرب کو پا لیتے ہیں وہ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

لکھا ہے خواجہ گیلانی بھی آپ کے اس جود و سخا سے اتنے متاثر ہوئے کہ دنیا کی دولت کو لات مار کر فقیر ہو گئے اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ اور پچیس ۲۵ برس تک آپ کی خدمت میں رہے۔ اس کے بعد آپ مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے۔ مگر ابھی راستے میں ہی تھے کہ جدہ پہنچ کر انتقال کر گئے۔ یہیں ان کا مزار ہے۔

جناب زکریا ملتانی کا یہ معمول تھا کہ خود تو روزے رکھتے اور سادہ غذا کھاتے مگر ایک خلق خدا کو بُلا بُلا کر باورچی خانے میں لاتے اور طرح طرح کے لذیذ کھانے کھلاتے اور انھیں کھانا کھاتے دیکھ کر خوش ہوتے۔

ایک مرتبہ ملتان میں سخت قحط پڑا۔ ملتان کے حاکم کو غلے کی ضرورت پڑی۔ آپ نے کئی من غلہ اُس کے پاس پہنچا دیا۔ جب وہ غلے کو بحفاظت کسی جگہ رکھوا رہا تھا تو اس میں سے نقرئی سکے کے سات کوزے بھی نکلے۔ ملتان کے حاکم نے آپ کو اس کی اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا ہمیں ان سے کوئی واسطہ نہیں یہ بھی ہم نے تمھیں کو بھیجے ہیں۔

ایک روز آپ نے خادم سے فرمایا۔ جاؤ فلاں صندوقچہ اٹھالاؤ۔ اس میں پانچ ہزار اشرفیاں پڑی ہیں۔ خادم گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا بھالا مگر اتفاق سے نہ ملا۔ خدمت میں واپس آیا۔ اور عرض کیا معلوم نہیں صندوقچہ کہاں رکھا ہے مجھے تو ملتا نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ الحمد للہ اور خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد خادم پھر آیا اور آکر صندوقچہ کے مل جانے کی اطلاع دی۔ آپ نے پھر فرمایا الحمد للہ ایک شخص جو آپ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ کہنے لگا۔ یا حضرت! آپ کے دونوں مرتبہ الحمد للہ کہنے کے کیا معنی ہیں؟ میں سمجھ نہیں سکا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم فقیروں کے نزدیک کسی شے کا وجود و عدم دونوں یکساں ہیں۔ اس لیے ہمیں نہ کسی شے کے آنے کی خوشی اور نہ کسی شے کے جانے کا غم۔ اس کے بعد آپ نے وہ پانچ ہزار اشرفیاں اسی وقت محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیں۔

آپ کسی سے اپنی تعظیم و تکریم کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے چند ایک درویش وضو کر رہے تھے کہ آپ بھی ان کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھ کر تمام درویش آپ کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ایک درویش نے جو وضو کر رہا تھا۔ اس وقت تک آپ کی تعظیم و تکریم نہیں کی جب تک وہ وضو سے فراغت نہ پا چکا۔ آپ نے فرمایا تم درویشوں میں سب سے افضل زاہد ہو۔

لیکن خود آپ دوسروں سے بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آتے۔ ایک موقع پر جلال الدین تبریزی نیشاپوری جب آپ سے علیحدہ ہو کر خراسان چلے گئے۔ اور کچھ عرصہ کے

بعد آپ سلطان التمش کی دعوت پر دہلی پھر تشریف لائے تو سلطان مع علماء و مشائخ کے شہر سے باہر آپ کے استقبال کو بڑھا اور ان کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا۔ پھر انھیں کو سب کا امام بنا کر ان کے پیچھے پیچھے شہر کو روانہ ہوا۔ کہتے ہیں شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو سلطان کی یہ ادا پسند نہ آئی اور وہ تبریزی سے حسد کرنے لگا اور بغض و حسد کی آگ یہاں تک بھڑک اٹھی کہ انھیں سلطان کی نگاہوں سے گرانے کے لیے ان پر زنا کا الزام لگا دیا اور اس جرم کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے ایک فاحشہ گواہی دینے کے لیے معاوضہ لے کر تیار ہو گئی۔

جب سلطان کے سامنے اس واقعے کو پیش کیا گیا تو سلطان سکتے میں آگیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی کبھی ایسا جرم نہ آسکتا تھا کہ جس کا کوئی ولی اللہ مرتکب ہو۔ ہر چند وہ سمجھتا تھا کہ یہ الزام غلط ہے اور گواہی دینے والی عورت جھوٹی ہے اور فاحشہ کار ہے۔ تاہم قانون کا تقاضا جب تک پورا نہ ہو وہ انصاف نہیں کر سکتا تھا۔ آخر اس نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہندوستان کے تمام علماء و مشائخ کو دربار میں تشریف لانے کی زحمت دی اور زکریا بہاؤ الدین سے بھی التماس کیا گیا چنانچہ آپ بھی دہلی تشریف لے گئے۔

دہلی کی جامع مسجد میں اس مقدمے کے فیصلے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ تمام علماء و مشائخ نے شرکت کی۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو زکریا کی اور جناب تبریزی کی آپس میں کشیدگی کا علم تھا اس نے اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے جناب زکریا بہاؤ الدین کو حکم مقرر کر دیا۔

جمعہ کی نماز کے بعد سوچی سمجھی بات کے مطابق فاحشہ عورت پیش ہوئی اور جناب تبریزی کو بھی طلب کیا گیا۔ جس وقت جناب تبریزی مسجد کے دروازے تک پہنچے تو تمام علمائے ربانی و مشائخ سبحانی آپ کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب حضرت اپنی جوتیاں اتار کر آگے بڑھے تو جناب زکریا نے آپ کی جوتیاں اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ سلطان نے یہ دیکھ کر کہ جس بزرگ کا جناب زکریا ایسے عالی مرتبت ولی اتنا ادب و احترام کریں وہ کیونکر مجرم ہو سکتا ہے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ بظاہر تو جناب تبریزی کو مجرم کہا جا رہا ہے اس لیے آپ کو

اس احترام سے روک دینا چاہا۔ اس پر جناب زکریا نے فرمایا میرے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ میں شیخ جلال الدین تبریزی کی خاک پا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں لیکن شیخ الاسلام نجم الدین حضری کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ میں نے جناب تبریزی کا احترام کر کے ان کے عیب کو چھپانے یا اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ گواہ کو پیش کیا جائے۔

کہتے ہیں جب فاحشہ عورت گواہی دینے کے لیے آپ کے سامنے لائی گئی تو اس پر آپ کی بزرگی و عظمت کا کچھ ایسا رعب طاری ہو گیا کہ وہ آپ کے قدموں میں گر پڑی اور اول سے لے کر آخر تک تمام واقعہ اگل دیا۔ اور شیخ الاسلام کی تمام سازش طشت از بام کر دی الغرض جناب تبریزی سے بڑی تعظیم و توقیر کے ساتھ معافی مانگی گئی اور نجم الدین کو شیخ الاسلام کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔

لکھا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سلطان نے آپ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ آپ شیخ الاسلام کا عہدہ قبول فرمالیں۔ چنانچہ آپ نے یہ عہدہ قبول فرمالیا جو آپ کے خاندان میں طویل عرصے تک قائم رہا۔

بعضوں نے شیخ الاسلام نجم الدین حضری کی اس ناپاک حرکت کے واقعہ کو جناب بختیار کاکی سے منسوب کیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہی صحیح ہو کیونکہ جناب کاکی کا اثر و نفوذ اور مقام و منصب دہلی والوں میں اتنا بلند ہو گیا تھا کہ نجم الدین حضری جلنے لگا یہی سبب ہے کہ جناب خواجہ معین الدین چشتی جب آپ سے ملنے دہلی تشریف لائے اور یہ حال دیکھا تو آپ سے فرمایا۔ بابا بختیار تمہارے یہاں رہنے سے کسی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ تم دہلی چھوڑ کر میرے ساتھ اجمیر چلے چلو۔ چنانچہ بابا اپنے مرشد کے ساتھ چلنے پر فوراً آمادہ ہو گئے۔ مگر اہل دہلی نے داد بلا کر کے آپ کو رکوا لیا۔ ممکن ہے یہ واقعہ ان دونوں بزرگوں ہی کے نام سے منسوب ہو کیونکہ تاریخوں سے اس بات کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ جناب تبریزی، حضرت بختیار کاکی سے ملنے کے لیے دہلی تشریف لائے تھے۔ سلطان کی دعوت پر نہیں بلکہ سلطان کو ان کے آنے کی بر وقت اطلاع ملی تھی۔ جس پر وہ آپ کے استقبال کو نکلا اور جناب

بختیار کاکی آپ کے استقبال کو علیحدہ بڑھے۔

تصانیف جناب زکریا بہاؤ الدین کی کسی تصنیف و تالیف کا حال تو معلوم نہیں۔ البتہ آپ نے اپنے مریدوں کو جو خطوط و وصایا تحریر کیے وہ بمنزلہ آپ کے ملفوظات کے ہیں "اخبار الاخیار" میں مل سکتے ہیں۔ آپ نے ۶۶۱ھ یا ۶۶۶ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار پُرانوار ملتان ہی میں مرجع خلائق ہے۔

آپ کی اولاد میں شیخ صدر الدین عارف ایک ولی کامل کی حیثیت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ والد محترم کی تمام خوبیاں سخاوت و فیاضی آپ کی طبیعت اور مزاج میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپ نے اپنے والد گرامی قدر کے انتقال کے بعد تمام دولت ایک ہی دن میں فقیروں اور مسکینوں محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دی۔ کسی نے اس پر آپ سے پوچھا کہ یا حضرت آپ کے والد ماجد تو اپنے خزانے میں نقد و جنس جمع رکھتے اور اس سے تھوڑا تھوڑا خرچ کرنا پسند کرتے تھے مگر آپ نے تو اپنے لیے ایک دام بھی نہ رکھا سب کچھ ایک ہی دن میں لٹا دیا۔ فرمایا حضرت بابا دنیا پر غالب تھے۔ اس لیے دولت ان کے پاس جمع رہتی اور اس میں سے تھوڑا تھوڑا خرچ کرتے رہتے۔ مگر مجھ میں یہ خوبی پیدا نہیں ہوئی۔ مجھے ڈر ہے کہ میں دنیا کے فریب میں نہ آجاؤں۔ اس لیے میں نے تمام دولت اپنے سے علیحدہ کر دی۔

ہمارے ہاں سہروردی سلسلہ جناب زکریا بہاؤ الدین ہی سے پھیلا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سہروردی سلسلے کے شیوخ کا بھی اجمالاً تذکرہ پیش کر دیا جائے۔
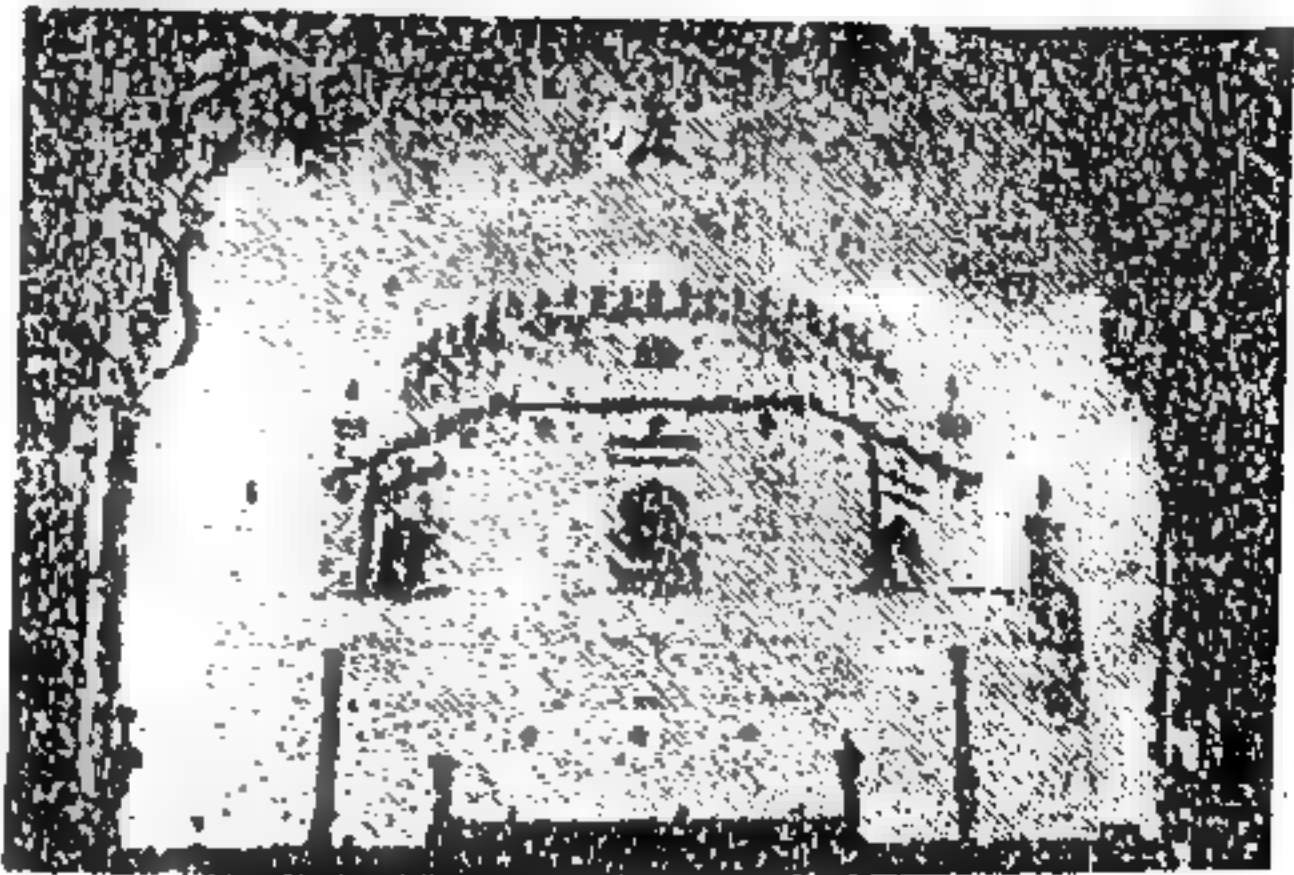
مدفن فخر ملتان فخر اولیا حضرت زکریا بہاؤ الدین

مسلمان فاتحین (مصور)

از احمد مصطفےٰ صدیقی

جن دس مسلمان فاتحین کے کارناموں کا اس کتاب میں تذکرہ ہے۔ وہ ہیں حضرت خالد بن ولیدؓ۔ حضرت ابو عبیدہؓ۔ حضرت عمرو بن عاصؓ۔ حضرت سعد بن وقاصؓ۔ حضرت طارق بن زیادؒ۔ حضرت محمد بن قاسمؒ سلطان محمد غزنویؒ۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ سلطان شہاب الدین غوری اور سلطان محمد فاتحؒ۔

فوٹو آفسیٹ طباعت۔ سفید کاغذ۔ سہ رنگا ٹائیٹل۔ مع نادر تصاویر

از مغلانی بیگم

جس میں ایک ہزار سے زائد مغلئی، پٹھانی، ایرانی عراقی۔ انگریزی

چینی ـــ اور ـــ ہندوستانی

کھانوں۔ آئس کریم۔ پڈنگ۔ مٹھائیوں۔ مربے اچار اور کیک بسکٹ۔ پیسٹری کے خوش ذائقہ نادر و نایاب نسخے جن کی آج تک تلاش تھی۔ درج ہیں۔ تین سو سے زائد صفحات۔ درجنوں تصاویر۔ فوٹو آفسیٹ پر طباعت۔ سفید چکنا کاغذ۔ چار رنگا ٹائیٹل۔

از احمد مصطفےٰ صدیقی

ہمارے پیغمبر حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی سوانح کا ایسا گلدستہ ہے جس میں چوبیسؑ سے زائد پیغمبر اور نبیوں کے حالات شامل ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان مقدس ہستیوں کے حالات پر وہی مضامین جمع کئے گئے ہیں جن کی صداقت پر اللہ کی کتاب معتبر "قرآن حکیم" کی مہر ثبت ہے

مقامات مقدسہ کی درجنوں تصاویر سے مزین۔ فوٹو آفسیٹ طباعت۔ سہ رنگا ٹائیٹل۔ سفید چکنا کاغذ۔ ڈھائی سو سے زائد صفحات۔
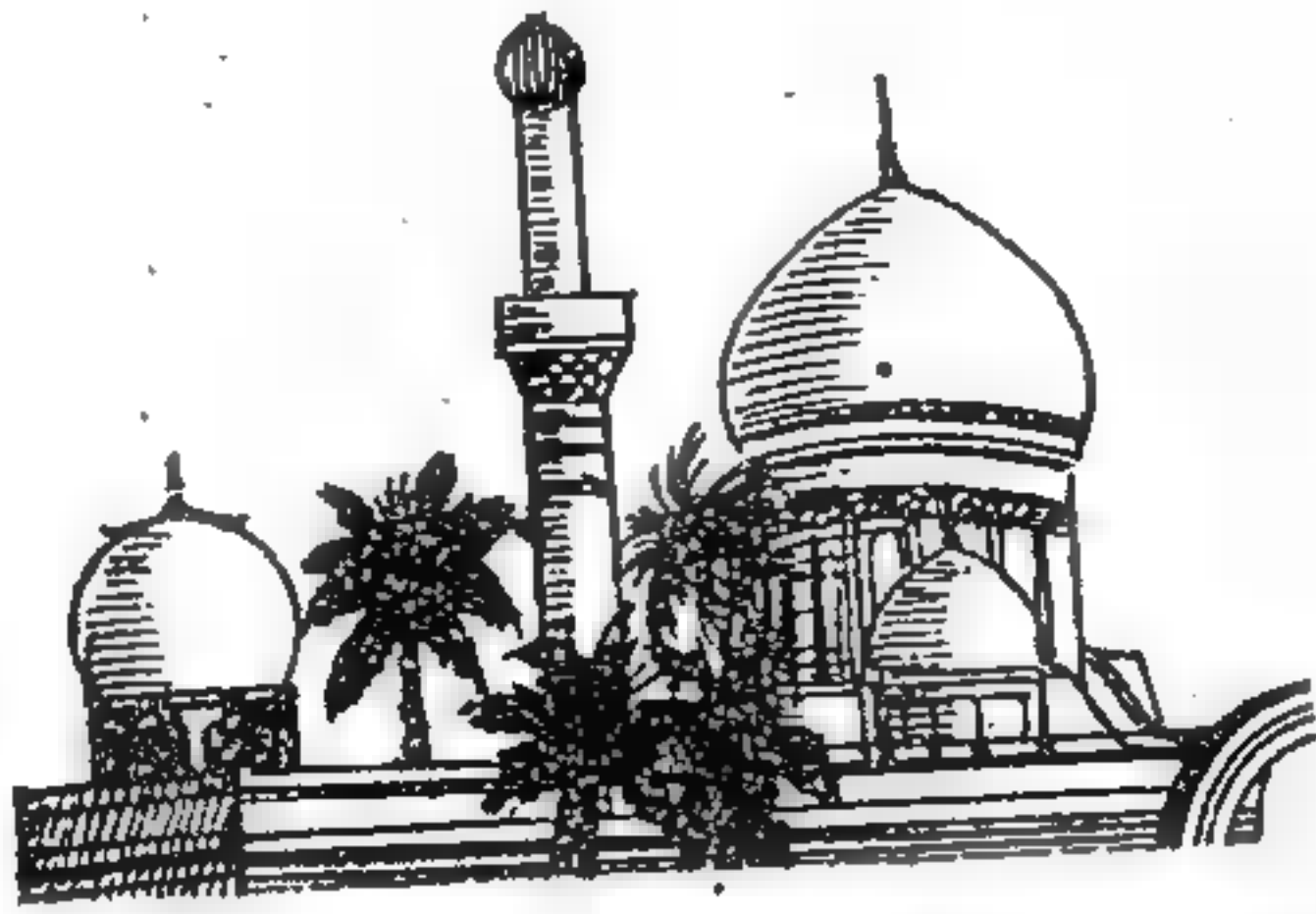
شیخ ابوالنجیب سہروردی

ولادت ۴۹۰ھ عراق کے ایک چھوٹے سے قصبے ونجان کے قریب سہرورد نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ شجرۂ نسب بارہ واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیق سے جا ملتا ہے۔

آغاز جوانی میں سہرورد سے تحصیل علم کے لیے بغداد چلے آئے، جہاں امام اسعد المتوفی ۵۲۷ھ مدرس اعلیٰ مدرسہ نظامیہ بغداد سے فقہ اور علم کلام کی تحصیل کی۔

علامہ ابوالحسن فصیحی النحوی المتوفی ۵۱۶ھ مدرس علم نحو سے علم ادبیہ کی تحصیل کی اور کئی محدثین کرام سے علم حدیث کی تعلیم پائی۔

غرض تھوڑے ہی دنوں میں ایک متبحر عالم ہو گئے۔ اپنے ہم عصر علماء میں نہایت شہرت و ناموری پائی۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ کے دل میں علوم باطنی کے حاصل کرنے کی لگن پیدا ہوئی۔

اگرچہ اپنے چچا شیخ وجیہ الدین ابوحفص عمر سہروردی کی صحبت میں بچپن ہی سے آپ کی طبیعت پر صوفیانہ رنگ تھا اور آپ فقر و درویشی کی طرف مائل تھے۔ لیکن اب

آپ کی عمر کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی جوان ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ آپ نے درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر کے علوم باطنی کی تحصیل کے لیے پہلے اپنے عم محترم کی طرف رجوع کیا۔ ان سے فراغت پانے کے بعد امام محمد غزالی کے بھائی احمد غزالی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے علم تصوف حاصل کیا اور منازل سلوک طے کیے۔

تذکرہ نویسوں نے بیان کیا ہے کہ آپ اپنے پیر بھائی محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں بھی پہنچے اور ان سے بھی استفادہ کیا۔

منازل سلوک طے کرنے کے بعد آپ نے دین اسلام کی اشاعت و خدمت کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور درس و تدریس کا سلسلہ پھر سے جاری کیا۔

۵۴۵ھ میں آپ نے سلجوقی بادشاہ مسعود اور المستضی بامراللہ عباسی خلیفہ کی خواہش پر مدرسہ نظامیہ بغداد کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آپ اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ مگر ۵۴۷ھ میں دو سال ہی کے بعد اس مدرسہ سے علیحدہ ہو گئے۔ واقعہ یہ ہوا کہ بغداد کے مشہور کاتب شیخ یعقوب جو مدرسہ ہی میں رہا کرتے تھے، فوت ہو گئے وہ چونکہ بے وارث تھے اس لیے حکومت کی طرف سے متعلقہ شعبہ کے افراد نے آکر ان کے سامان پر قبضہ کر کے تالا ڈالنا چاہا۔ طلباء مزاحم ہوئے۔ اس پر مدرسہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جناب شیخ اس ہنگامہ سے کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ عہدے ہی سے مستعفی ہو گئے۔

اس کے بعد آپ نے اپنا مدرسہ جو پہلے سے قائم تھا دوبارہ جاری کیا۔ جس میں فقہ و حدیث کے بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے۔ مثلاً امام فخر الدین ابو علی واسطی، قاضی ابو الفتوح تکریتی۔ علامہ کمال الدین ابن الانباری، علامہ ابن الخبیری۔ حافظ ابن عساکر، علامہ حافظ قاسم ابن عساکر، حافظ عبدالکریم سمعانی وغیرہ محدثین و اکابرین آپ کے شاگردان رشید ہیں۔ غرض یہ کہ آپ کے چشمہ فیض و عرفان سے ایک عالم سیراب ہوا۔

طریقت کے علم میں بھی آپ کے اخلاص کیشان تصوف کی تعداد بے شمار ہے جن میں سے چند مشہور مشائخ و اولیائے کرام یہ ہیں۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی شیخ نجم الدین کبریٰ، شیخ عبداللہ مطروی، شیخ جمال الحق والدین عبدالصمد زنجانی، خواجہ اسمٰعیل

قیصری وغیرہم صوفیا واکابر اولیائے کرام آپ ہی کے مریدین خاص اور آپ کے خلفائے با اخلاص ہیں۔

آپ کا سلسلۂ طریقت سہروردیہ کے نام سے تمام عالم اسلام میں پھیلا اور خوب پھیلا۔ جناب شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی۔ مولانا فخرالدین عراقی حضرت امیر حسینی سادات مولانا جلال الدین رومی، جناب خواجہ فریدالدین عطار جیسی مقدس ہستیوں کے علاوہ شیخ الاسلام سید نورالدین مبارک غزنوی، مولانا مغربی، مخدوم جہانیاں سید السادات مخدوم جلال الدین بخاری، خواجہ نجیب الدین فردوسی، مولانا شمس الدین تبریزی اور شیخ الاسلام جناب غوث زکریا بہاؤ الدین ملتانی وغیرہم بزرگانِ دین آپ ہی کے سلسلہ سہروردیہ کے مشائخ اعلام ہیں۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار مبارک کا اندرونی منظر
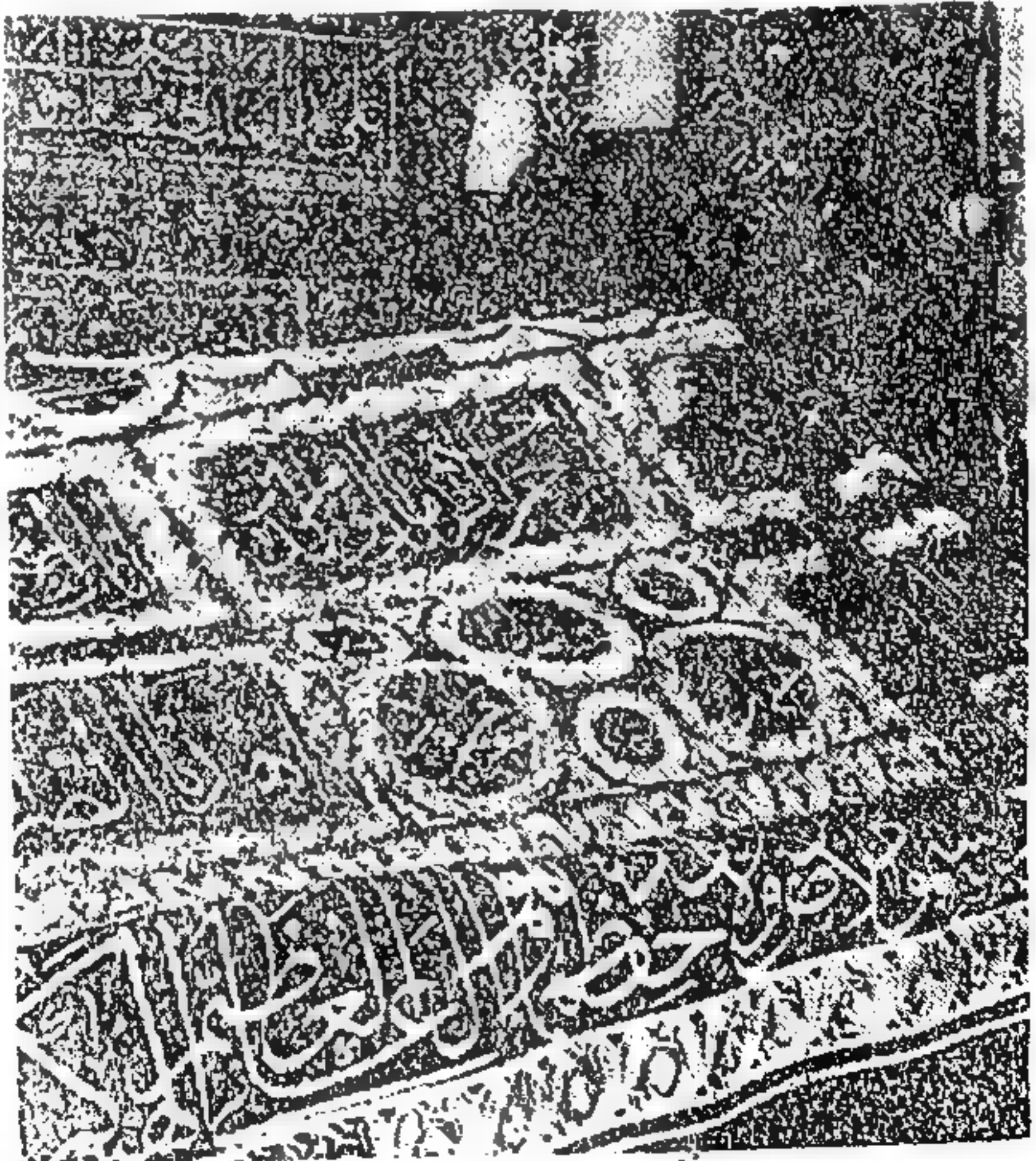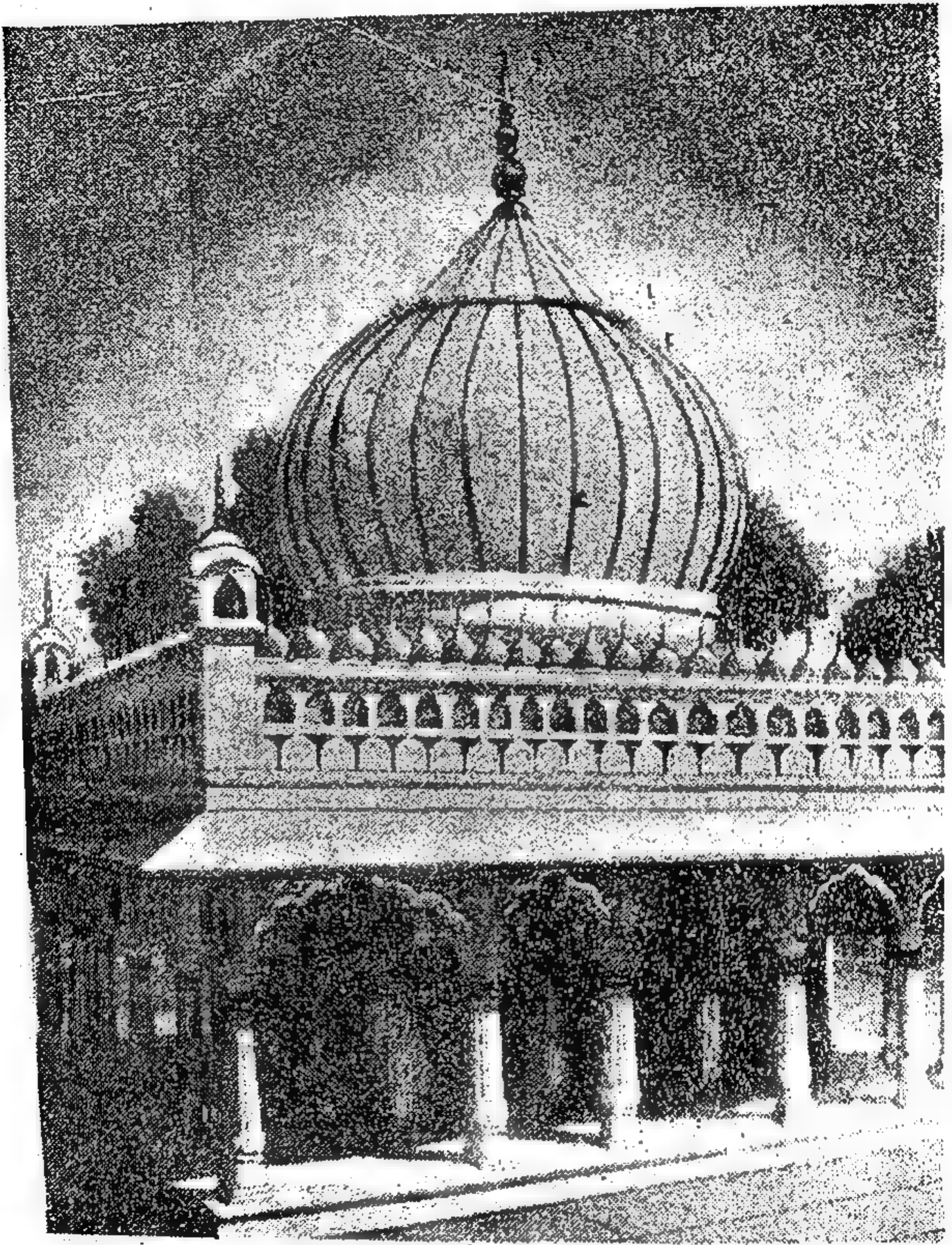
درگاہِ عالیہ حضرت نظام الدین اولیاؒ دہلی
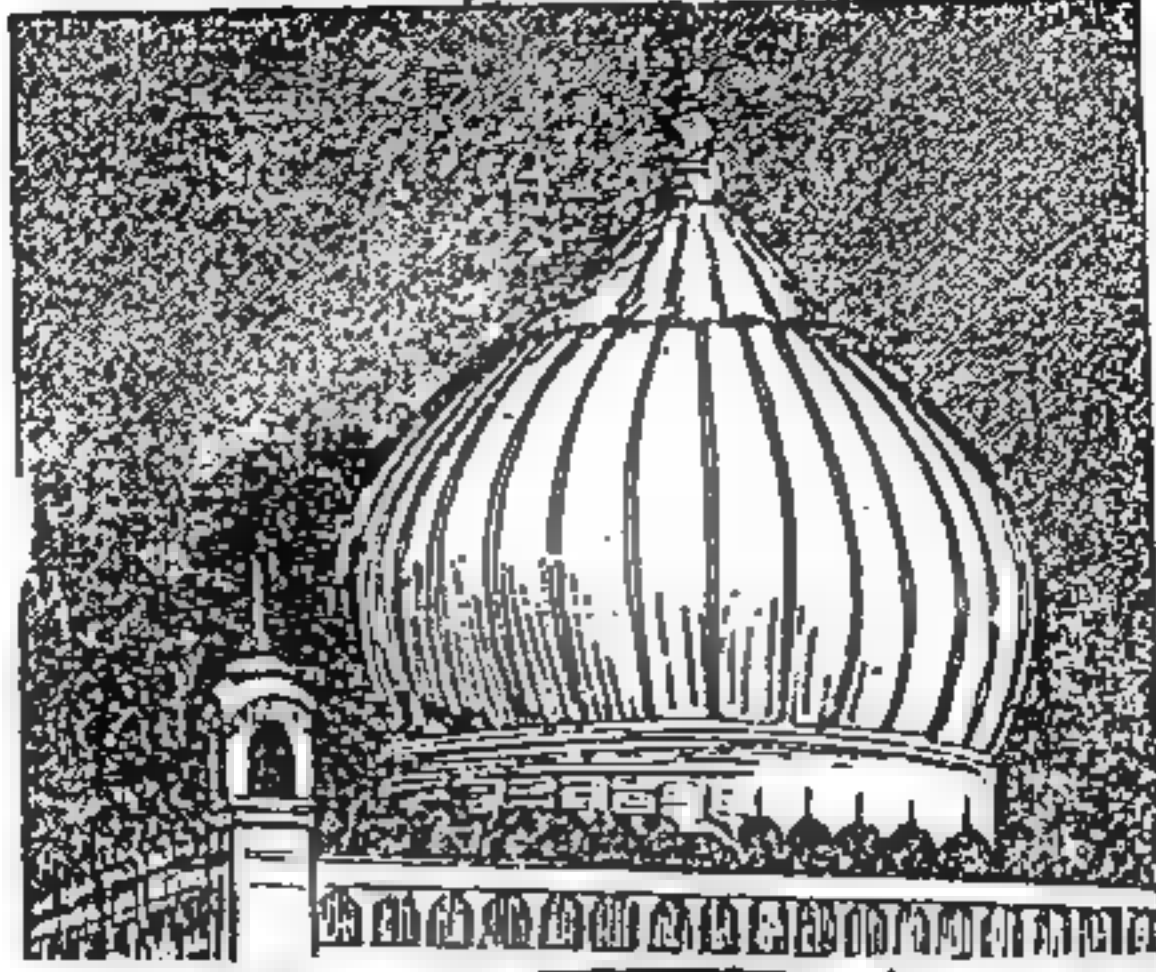
سید محمد المعروف سلطان المشائخ۔

آپ کے باپ دادا کسی زمانے میں بخارا سے نکل کر بدایوں آ رہے۔ جہاں ۶۳۶ھ سلطان التمتش کے زمانے میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

آپ ابھی پانچ برس کے تھے کہ آپ کے والد محترم جناب مولانا سید احمد کا سایہ آپ کے سر سے اُٹھ گیا اور آپ یتیم ہو گئے۔

آپ کی والدہ محترمہ سیدہ بی بی زلیخا ایک سمجھ دار اور دین کی تعلیمات سے واقف خاتون تھیں۔ مولانا کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش، تربیت کا بار تنہا سیدہ ہی نے اُٹھایا۔ انھوں نے آپ کو ابتدائی تعلیم دی اور آپ کے دل میں دین کی اشاعت کے حصول کا شوق پیدا کیا۔

بی بی زلیخا سوت کاتتیں اور اس سے جو معاوضہ میسر آتا اس سے گھر کے اخراجات چلاتی تھیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کئی کئی روز فاقے سے گزر جاتے لیکن جناب نظام الدین باوجود نہایت کم سن ہونے کے کیا مجال جو لب پر ایک حرف کبھی شکایت کا لے آتے بلکہ صبر و تحمل اور

حوصلے کے ساتھ علوم دین کی تحصیل میں لگے رہتے۔

جس روز کھانے پینے کو گھر میں کچھ نہ ہوتا بی بی کہتیں "بابا نظام آج ہم اللہ میاں کے مہمان ہیں!" بھولا بھالا نظام بھی اس مہمانی کا اتنا قدر دان تھا کہ ہمیشہ اس کے دل میں یہی خیال رہتا کہ وہ دن کب آئے گا جب اماں پھر کہیں گی "بابا نظام آج ہم اللہ میاں کے مہمان ہیں!"

ماں کی اس خاص توجہ اور تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ سولہ برس ہی کی عمر میں تمام علوم دین میں کامل ہو گئے۔ تفسیر، حدیث، فقہ پر انھیں دسترس ہو گئی۔

تعلیم سے فراغت پائی تو والدہ محترمہ نے تمام شہر کے علما و فضلاء کو جمع کیا اور اپنے ہاتھ سے بنتے ہوئے سوت کی آپؒ کے سر پر پگڑی بندھوائی۔

اس کے بعد مزید تحصیل باطنی کے لیے آپ اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو لے کر بدایوں سے دہلی آ گئے۔ جہاں آپ کو شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ مولانا خوارزمی اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ سلطان بلبن ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔

خواجہ صاحب دہلی میں ہلال طشت دار کی مسجد کے نیچے ایک حجرے میں رہا کرتے تھے ان کے قریب ہی خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل رہتے تھے۔ آپ اکثر ان کے مکان پر جایا کرتے تھے اور ان کی زبانی آپ کو جناب فریدالدین گنج شکر کے فیض باطنی و کمالات علمی کا حال معلوم ہوا۔

آپ کو ان سے ملاقات کرنے کا بے حد اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ سے ملاقات کرنے کے لیے پاکپٹن روانہ ہوئے۔ جب آپ باباصاحب کی خدمت میں پہنچے تو باباصاحب نے آپ کو دیکھتے ہی ایک شعر پڑھا اور گلے سے لگا لیا۔ آپ ایک مدت تک ان کے پاس رہے ان سے بیعت کی اور خرقۂ خلافت پایا۔

ان دنوں بابا کے لنگر میں بڑی تنگدستی تھی۔ آپ کے درویش یہ کیا کرتے کہ اپنے حصے کا ایک ایک کام لے لیتے اور اس کو سرانجام دیتے۔ چنانچہ مولانا بدرالدین اسحٰقؒ لنگر خانہ

کے لیے جنگل سے ایندھن لاتے۔ شیخ جمال الدین ہانسوی ایک جنگلی پھل ڈیلا اچار بنانے کو لاتے حسام الدین کابلی پانی بھرتے اور برتن صاف کیا کرتے اور خواجہ صاحب کے ذمے کھانا پکانے اور کھلانے کا کام تھا۔ کہتے ہیں ایک روز کھانے میں نمک کی کمی تھی۔ آپ بازار گئے اور کسی بنیے سے ادھار پر نمک لے آئے۔ بابا صاحب کو جب معلوم ہوا تو لقمہ سے ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا:

ازیں بوئے اسراف می آید

آپ نے عرض کیا قرض کا نمک آیا ہے۔ بابا نے فرمایا: درویشوں کے لیے قرض سے موت بہتر ہے۔ اگر کسی مقروض درویش کو اچانک موت آجائے تو قیامت میں اس کی گردن جھکی رہے گی۔ خواجہ صاحب نے اسی وقت کانوں کو پکڑ لیا اور آئندہ قرض لینے سے توبہ کی۔ بابا صاحب نے خدا کی بارگاہ میں آپ کے لیے دعا کی اے پروردگار یہ تجھ سے جو کچھ مانگا کرے اسے عنایت کر دیا کر۔ بابا کی یہ دعا قبول ہوئی۔ اسی لیے جناب نظام الدین کو محبوب الہٰی کہا جاتا ہے۔

آخری مرتبہ جب آپ دہلی سے پاکپٹن اپنے مرشد جناب بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی زیارت کو گئے تو آپ کو بابا صاحب نے پھر ایک دعا دی۔ فرمایا نظام الدین اللہ تعالیٰ تمھیں نیک بخت بنائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ تم ایک ایسے درخت ہو گے جس کے سایے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق آرام پائے گی۔

چنانچہ بابا صاحب کی یہ دعا اور پیش گوئی بھی آپ کے حق میں حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اولیائے کرام کی فہرست میں شاید ہی کوئی ایسا ولی نظر آئے جس کے قرب و صحبت کی بادشاہوں تک نے آرزو کی ہو۔

آپ کے لنگر خانہ کا عالم یہ تھا کہ سینکڑوں غریب و مسکین، گونگے لنگڑے اور اپاہج کھانا کھاتے۔ ان کے علاوہ باہر سے جو سیاح آتے انھیں بھی یہاں آرام میسر آتا اور وہ مہینوں آپ کے مہمان رہتے اور سینکڑوں اشرفیاں اور زادِ راہ لے کر واپس جاتے۔

آپ کا معمول یہ تھا کہ جب تمام لوگ کھانے سے فارغ ہو جاتے تب اپنا کھانا

منگواتے اور تناول فرماتے۔ آپ نے عمر بھر کبھی مرغن اور عمدہ غذا نہیں کھائی۔ عموماً جو کی روٹی اور اُبلی ہوئی ترکاری ہوتی کبھی رو پڑتے اور فرماتے جی نہیں چاہتا کہ اللہ کے ہزاروں بندے مسجدوں، بازاروں اور گھر کے کونوں گوشوں میں بھوکے پیاسے پڑے ہوں اور میں مزے مزے کی چیزیں کھاؤں۔ سردی کے دنوں میں فرماتے بارِ الٰہا! کس غضب کی سردی ہے غریب لوگ تیرے عاجز بندے کس طرح برداشت کر رہے ہوں گے۔

ایک مرتبہ ایک شخص کے مکان کو آگ لگ گئی۔ لوگ اس کی مدد کو دوڑے۔ آپ بھی لوگوں کے ساتھ آگ بجھانے کو دوڑے۔ آتش زنی سے اس غریب کا بڑا نقصان ہوا۔ آپ کو اس کی بربادی پر سخت قلق ہوا۔ آپ نے خادم سے فرمایا۔ لنگر سے اس کے بیوی بچوں کے لیے کھانا لے جاؤ اور اتنی رقم بھی دے آؤ جس سے اس کی ضروریات آسانی سے پوری ہو جائیں۔

شان کی بے پروائی یہ تھی کہ اکثر بادشاہوں کو آپ سے میل جول بڑھانے کی تمنا رہتی وہ چاہتے کہ آپ ان کے پاس تشریف لائیں۔ غیاث الدین بلبن کے پوتے معزالدین کیقباد کو آپ سے دلی محبت تھی۔ اس نے اسی سبب سے آپ کے مسکن کے قریب ہی اپنا محل تعمیر کرایا اور اس میں سکونت اختیار کی۔ لیکن آپ اس کی تعمیر کی ہوئی مسجد میں جانے کے سوا کبھی اس کے پاس نہیں گئے۔

کیقباد کے بعد جب جلال الدین خلجی کا زمانہ آیا تو اس نے بھی آپ کے قرب کی خواہش کی۔ لیکن آپ نے منظور نہ کیا۔ اس کے بعد علاء الدین خلجی آیا تو اس نے بھی آپ کو نہایت قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ آپ کے اشعار کو کئی کئی مرتبہ پڑھتا اور زار و قطار رونا جاتا۔ علاؤ الدین کو بھی آپ کے قرب کی حسرت ہی رہی۔ مگر اس نے اس آرزو کی تکمیل کے لئے اپنے ولی عہد خضر خاں اور چھوٹے بیٹے شادی خاں کو آپ کی مریدی میں دے دیا۔

علاء الدین کے مرنے کے بعد سلطنت کے احوال میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں کہ خضر خاں تاجدار ہند نہ بن سکا۔ علاء الدین کے تیسرے بیٹے قطب الدین خاں نے سلطنت اپنے زیر نگیں کر لی اور اپنے بڑے بھائی خضر خاں کو پہلے اندھا کر دیا پھر اپنے دوسرے بھائی

شادی خاں سمیت اسے قتل کر دیا۔

قطب الدین ایک ناتجربہ کار اور نوعمر بادشاہ تھا۔ اسے یہ دیوانگی ہو گئی کہ وہ کسی طرح لوگوں کے دلوں سے آپ کی عظمت مٹا دے۔ چنانچہ اس نے بزورِ شمشیر اس ناپاک ارادے میں کامیاب ہونے کی کوشش کی۔ اس نے آپ کو اپنے دربار میں بلانے کے لیے حکم دیا کہ تمام علماء و فضلاء کی طرح سلام کی غرض سے آپ بھی میرے حضور میں پیش ہوا کریں۔ آپ نے اسے کہلا بھیجا کہ بادشاہوں سے ملنے کا ہم فقیروں کا دستور نہیں! قطب الدین اس جواب پر بڑا سیخ پا ہوا اور کہا کہ اگر وہ نہ آئیں گے تو میں زبردستی بلاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ اس مہینے کے فلاں دن مجھ سے ملاقات کریں! آپ کو یہ اطلاع ہوئی تو فرمایا میں اپنی رائے بدل سکتا ہوں لیکن بزرگوں کے طریقے کو نہیں بدل سکتا۔

قدرت خدا کہ جب وہ مقررہ دن آیا تو یکایک شور و غل ہوا کہ سلطان قطب الدین مارا گیا۔ قطب الدین اپنے ایک حسین و جمیل نوخیز غلام خسرو پہ ہزار جان سے فدا تھا۔ اس نے اپنی حکومت قائم کرنے کی آرزو میں موقع پا کر قتل کر دیا۔ اور ہزار ستون کی چھت پر اس کا سر کاٹ کر نہایت ذلت و حقارت سے نیچے پھینک دیا۔

خسرو خاں ایک نومسلم ریاکار ہندو بچہ تھا۔ اس کی آرزو پوری نہ ہو سکی کہ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ خلجیوں کے بعد تغلقوں کا زمانہ آیا۔ غیاث الدین تغلق خسرو کو ٹھکانے لگانے کے بعد امورِ سلطنت کی طرف متوجہ ہوا۔ اراکین حکومت نے اسے ایک مذہبی مجلس قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی جس میں دین کے مسائل پر آپس میں تبادلہ خیالات ہوا کرے۔ چنانچہ یہ مجلس قائم ہوئی اور اس میں سب سے پہلے سماع کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ اور جناب نظام الدین محبوب الٰہی کو دعوت دی گئی۔ آپ اس مجلس میں تشریف لے گئے اور اس مسئلہ پر ایک ایسی مدلل اور پُر مغز تقریر فرمائی کہ شرارت کرنے والوں کے تمام ارادوں پر پانی پھر گیا۔ بادشاہ بے حد خفیف ہوا اور شرمندہ ہو کر بنگالہ کی مہم پر چلا گیا۔

ایک مدت کے بعد جب وہ مہم سے فراغت پا کر دہلی کی طرف روانہ ہوا تو اس

نے آپ کو یہ کہلا بھیجا کہ میرے دہلی پہنچنے سے پہلے پہلے شہر چھوڑ کر چلے جائیں۔ آپ نے فرمایا "ہنوز دہلی دور است"۔ کہتے ہیں اس نے آپ کو کئی دفعہ پیغام بھیجا اور آپ نے ہر مرتبہ یہی جواب ارشاد فرمایا۔

غیاث الدین تغلق کے ولی عہد نے باپ کے استقبال کے لیے بڑی دھوم دھام سے تیاریاں کیں۔ شہر کی آبادی سے دو میل کے فاصلے پر ایک چوبی محل تیار کیا جب تغلق وہاں پہنچا اور اسی محل میں اس کی شاندار دعوت کی تو عین اس وقت کہ جب تمام لوگ کھانا کھا چکے اور باہر آگئے اور یہ اپنے چند مقربین کے ساتھ ابھی محل ہی کے اندر تھا قدرتِ خدا کہ یکایک محل کی چھت گر گئی اور سلطان مع اپنے مقربین کے اس میں دب کے مر گیا۔

تغلقوں کے بعد جب مغلوں کا زمانہ آیا۔ انھوں نے آپ کی توقیر و عظمت تمام بادشاہان ہند میں سب سے بڑھ چڑھ کر کی۔ ان کی اکثر یہ خواہش رہی کہ آپ ان کے ہدیے اور نذرانے قبول فرمائیں۔ اکثروں نے آپ کے متعلقین اور عزیزوں رشتہ داروں کو بیچ میں ڈالا اور سفارشیں کروائیں اور کہا کہ اگر آپ اپنے لیے کچھ نہیں لیتے تو لنگر خانے کے لیے ہی کچھ قبول کرلیں۔

آپ نے مکرّر طبیعت سے کہا، ہم فقیروں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم جاگیردار بنیں۔ ضرورتوں کو پورا کرنے والا صرف وہی کارساز ہے اور میں نے اسی پر توکل کیا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کی اولاد نے بھی آپ کے بعد اسی نظریے پر عمل کیا۔ مغلوں نے کئی مرتبہ بڑی بڑی جاگیریں اور دیہات دینے چاہیں لیکن انھوں نے کبھی قبول نہ کیے۔

۷۲۵ھ کو آپ کو مرض الموت لاحق ہوا۔ آپ نے حکم دیا کہ گھر میں جو کچھ ہے وہ سب غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے بعد لنگر خانے کے مہتمم کو بلا کر فرمایا کہ باورچی خانے میں اس وقت جتنا بھی اناج اور غلّہ محفوظ ہے وہ اسی وقت کھڑے کھڑے سب کا سب تقسیم کر دو۔ یہاں تک کہ ایک دانہ باقی نہ رہے۔

وصال کے دنوں آپ کو بار بار غشی پڑتا جب ہوش میں آتے تو یہی سوال کرتے

نماز کا وقت ہوا، کوئی مسافر آیا، اگر آیا ہے تو اس کی خاطر مدارات اور تواضع کرو، نماز کا وقت آیا ہے تو مجھے بٹھاؤ اور نماز پڑھاؤ۔ اللہ اللہ یہ شان تھی بزرگان دین کے شرعی محافظ ہونے کی اور یہی وہ ان بزرگوں کی کرامت ہے کہ جس کے سبب آج تک ان کا نام زندہ ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت قائم ہے اور یہ ان بزرگوں کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج چمن اسلام سرسبز و شاداب ہے۔

تذکرہ نویسیوں نے لکھا ہے کہ آپ کے دسترخوان پر کئی کئی ہزار لوگ کھانا کھاتے تھے۔ مگر لوگ حیران تھے کہ اتنا روپیہ آپ کے پاس کہاں سے آتا ہے اور جب وہ یہ دیکھتے کہ نذر و نیاز کی رقمیں بھی اپنے پاس نہیں رکھتے۔ بلکہ اسی وقت فقیروں میں بانٹ دیتے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہتی۔

ایک مرتبہ علاؤالدین خلجی نے آپ کی خدمت میں پانچ سو اشرفیاں نذر بھیجیں۔ اس وقت ایک فقیر آپ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کہا بابا اس میں نصف میرا ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ سب تمہارا ہے اور یہ کہہ کر تمام اشرفیاں اسے دے دیں۔

مستحقین میں دولت کو تقسیم کرنا تو خیر آپ جانتے ہی تھے کہ یہ انہی کا حصہ ہے مگر ایک بات ایسی بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ جس سے آپ کے اخلاق حمیدہ اور عالی ظرف ہونے کا بھی یہ ایک اندازہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ایک شخص آپ کو گالیاں دیتا اور آپ اسے دو اشرفیاں دیتے۔ ایک دن لوگوں نے اسے غیرت دلائی تو اس نے آپ کو گالیاں دینا ترک کر دیا اور وعدہ کیا کہ میں اب آپ کی شان میں گستاخی نہیں کروں گا۔ چنانچہ جب اس روز آپ کی خدمت میں گیا تو چپ رہا۔ مگر جب چلنے لگا تو اپنا وظیفہ مانگا۔ آپ نے فرمایا میرا حق بھی مجھے دے دو۔ کہتے ہیں ایک مدت کے بعد جب اس کا انتقال ہوا اور آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ اس کی قبر پر گئے اور یہ دعا کی۔ اے پروردگار اس کو بخش دے میں نے اس کی غلطیوں کو بخش دیا۔

آپ نے ۷۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ سے حسن عقیدت و ارادت مندی رکھنے والے مسلمان نظامی کہلاتے ہیں اور وہ آج ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

تصانیف

آپ کے وہ ملفوظات جن کی حیثیت آپ کی تصنیفات کی ہے یہ ہیں: (۱) فوائد الفوائد (۲) افضل الفوائد (۳) راحت المحبین۔

کلیر شریف (رڑکی)

حضرت امیر خسروؒ

۸
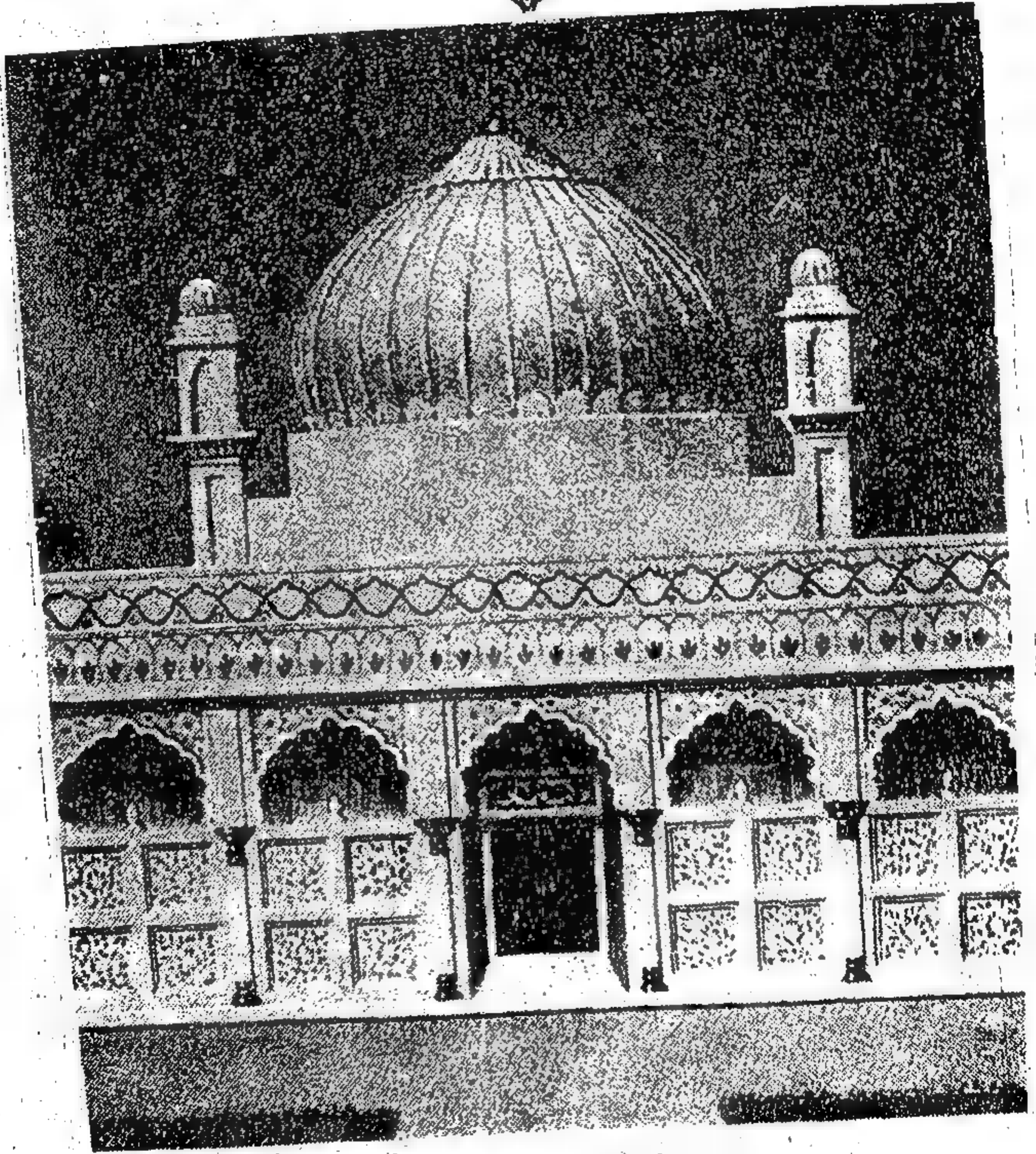
خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے مریدانِ عقیدت کیش میں جو اپنے مرشد کے نام کے شیدائی نہیں دیوانے تھے۔ جناب امیر خسرو سرِ فہرست ہیں۔

آپ ۱ ۶۵ ھ میں ضلع ایٹہ کے ایک چھوٹے سے قصبے پٹیالی میں پیدا ہوئے بعضوں نے آپ کی جائے ولادت پٹیالہ تحریر کی ہے، جو شاید سہو کتابت ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی فضیلت و کمالِ شاعری میں بعض لوگوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جناب شیخ سعدی شیرازیؒ ایسے بزرگ آپ سے ملنے کے لیے ایران سے ہندوستان آئے۔ اگر ان ہر دو بزرگوں کے سنین ولادت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حسنِ عقیدت نے حدِ اعتدال سے بڑھ کر واقعہ میں غلو و مبالغہ آرائی کی ہے۔

مولانا حالی تحریر فرماتے ہیں کہ اکثر تذکرہ نویسوں کو شبہ ہوا ہے اور جناب شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی جناب امیرؒ سے ملنے شیراز سے ہندوستان تشریف لائے۔ لیکن اس واقعہ کا کچھ ثبوت نہیں۔ بلکہ شیخ سعدی اور امیر خسرو کے زمانے کا مقابلہ کرنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جناب شیخ کا امیر خسرو سے ملاقات کے لیے آنا قطعاً خلافِ قیاس ہے۔

خسرو کی ولادت ۱ ۶۵ ھ میں ہوتی ہے جبکہ شیخ سعدی کی عمر ۷۰ برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اب اگر بفرضِ محال امیر خسرو کی شہرت پچیس برس ہی کی عمر میں ایران تک پہنچ گئی ہو تو اس وقت شیخ سعدی کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہیے۔ پس یہ کیوں کر خیال میں آسکتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یگانۂ روزگار اور مقبولِ عام و خاص ہو۔ ایک پچیس برس کے نوجوان کی شہرت سن کر ایران سے ہندوستان آئے۔

البتہ معتبر حوالوں سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے قاآن محمد سلطان ناظم ملتان نے جسے خان شہید بھی کہتے ہیں جناب شیخ سے دوبار درخواست کی کہ آپ شیراز سے یہاں تشریف لائیں اور چونکہ امیر خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں میں تھے۔ اس لیے ان کا کلام بھی جناب شیخ کی خدمت میں بغرض ملاحظہ بھیجا۔

جناب شیخ اس وقت بہت معمر ہو چکے تھے اس لیے خود تو نہ آسکے مگر اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے دو دیوان خان شہید کو بھیجے اور جناب امیر خسرو کے بارے میں تحریر فرمایا کہ اس جوہر قابل کی تربیت و حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

مولانا شبلی نے امیر خسرو کا سن ولادت ۶۰۵ھ بیان کیا ہے اور کہتے ہیں کہ ۶۸۸ھ میں آپ چھبیس برس کے تھے۔ حالانکہ اس حساب سے اس وقت آپ کی عمر ۸۳ برس کی ہونی چاہیے۔ پھر آگے چل کر آپ کی بیعت کا حال بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ بیالیس برس کی عمر میں امیر خسرو نے جناب محبوب الٰہی کے دست حق پرست پر بیعت کی۔

امیر خسروؒ کی ولادت سے متعلق اگر مولانا کا یہ بیان درست مان لیا جائے تو بعد کے دونوں بیان غلط ثابت ہوں گے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ مولانا کی غلطی نہیں ہو کتابت ہوگی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعضوں نے واقعہ ملاقات کو صحیح تسلیم کیا ہے اور اس پر اصرار کیا ہے تو لامحالہ پھر کہنا پڑتا ہے کہ شاید مولانا شبلی مرحوم بھی یہی خیال کرتے ہوں گے کہ ولادت خسرو ۶۰۵ھ میں ہوئی۔

اگر جناب شیخ سعدی ۵۸۹ھ یا ۵۷۹ھ یعنی چھٹی صدی ہجری کے شروع میں پیدا ہوئے تو اس اعتبار سے ہر دو بزرگوں کی عمروں میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے اس لیے اس بات کو تسلیم کرنے میں پھر کوئی عذر باقی نہیں رہتا کہ جناب شیخ سعدی یقیناً ہندوستان تشریف لائے اور جناب امیر خسرو سے ملاقات کی۔

جناب امیر خسرو جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت

تھا۔ جب پہلی مرتبہ آپ کو بلبن کے دربار میں بلایا گیا اس وقت آپ بہت ہی کم عمر تھے۔ دوسری مرتبہ جس وقت پھر بلائے گئے اس وقت بھی آپ فنِ شاعری کے لحاظ سے بلندی سے آگے نہیں بڑھے تھے۔

یہ بات کسے معلوم نہیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ ہی طبیعت میں پختگی آتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ عہدِ بلبن تک آپ نے شاعری میں ابھی کوئی مقام حاصل نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد خلجیوں کا دور آیا۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ اگر ولادتِ خسرو کا واقع ہونا بلبن ہی کے عہدِ حکومت میں صحیح ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ۶۵۰ھ کو ولادتِ خسرو کا صحیح سنِ ولادت مان لیا جائے۔

وجہ تسمیہ امیر جلال الدین خلجی ایک علم دوست اور ادب نواز حکمراں تھا۔ اس لیے اس نے اپنے عہدِ حکومت میں خسرو کو اپنا مصاحبِ خاص مقرر کیا۔ اور مصحف داری (قرآن مجید رکھنے) کی خدمت تفویض کی۔ اس صلے میں خسرو کو لباسِ خاص عطا ہوا اور ایک معقول مشاہرہ بھی ملا اس کے علاوہ امارت کا عہدہ بھی دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ لباس بھی عنایت کیا گیا جو امرائے خاص کے لیے مخصوص تھا۔ پس اسی وجہ سے آپ امیر کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

۶۹۴ھ میں جلال الدین خلجی اپنے بھتیجے علاء الدین خلجی کے ہاتھوں دھوکے سے قتل ہو گیا اور زمامِ حکومت علاء الدین کے ہاتھ آ گئی۔ اگرچہ یہ شخص بڑا ظالم و سفاک اور بے رحم تھا لیکن اس کے باوجود وہ حیرت انگیز حد تک نہایت علم دوست اور قدر شناس تھا۔ اس کے دربار میں علماء فضلاء و شعراء جمع رہتے اور ان میں امیر خسرو کی حیثیت یوں تھی جیسے کالبدر فی النجوم یعنی ستاروں میں چاند۔

مولانا شبلی کہیں تو لکھتے ہیں کہ امیر خسرو کے والد محترم جناب امیر یوسف الدین محمود نے انھیں آٹھ برس کی عمر میں خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے قدموں میں لا کر ڈال دیا اور خیر و برکت کے لیے بیعت کرا دی۔ اور کہیں لکھا ہے کہ والد کے انتقال کے وقت خسرو صرف سات سال کے تھے۔

صحیح یہ ہے کہ جناب امیر خسرو غالباً ۶۹۹ھ بیالیس سال کی عمر میں جناب خواجہ کے حلقہ بگوش ارادت ہوئے اور آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ معلوم نہیں یہ واقعہ کہاں تک درست ہے۔ بہر کیف تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اوّل اوّل جب آپ جناب خواجہ کی خدمت میں چلے ہیں اور ان سے بیعت کرنے کا ارادہ کیا ہے تو خواجہ کے دروازے پر پہنچ کر بجائے اندر جانے کے چوکھٹ پر بیٹھ گئے اور دل میں یہ سوچنے لگے کہ اگر خواجہ ولی کامل ہیں تو اپنے کشف سے میرے اس قطعہ کے جواب میں کچھ ارشاد لکھوا بھیجیں۔

تو آں شاہے کہ بر ایوان قصرت
کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد
بیاید اندروں یا باز گردد

ترجمہ: آپ بادشاہ ہیں کہ جن کے محل کی چھت پر اگر کبوتر آکر بیٹھ جائے تو باز بن جائے۔ ایک غریب حاجت مند آپ کے دروازے پر حاضر ہوا ہے۔ کہیے اندر چلا جائے یا واپس لوٹ جائے۔

جناب خواجہ نے اپنے کشف روحانی سے یہ بات معلوم کر لی اور اپنے ایک خادم سے فرمایا۔ جاؤ ایک ترک زادہ باہر بیٹھا ہے اس کے سامنے یہ شعر جا کر پڑھ دو اور واپس چلے آؤ۔

بیاید اندروں مردِ حقیقت
کہ با مایک نفس ہم راز گردد
اگر ابلہ بود آں مرد ناداں!
ازاں راہے کہ آمد باز گردد

ترجمہ: مردِ حقیقت اندر چلا آئے تاکہ ہم کچھ وقت آپس میں راز و نیاز کی باتیں کر لیں اور اگر مردِ ناداں و بے وقوف ہے تو جس

راستے سے آیا ہے اسی راستے سے واپس چلا جائے۔

امیر خسرو خادم کی زبان سے آپ کے یہ فی البدیہہ شعر سن کر بے تابانہ دوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے قدموں میں سر رکھ دیا اور آپ ان کے مرید ہو گئے۔ یوں تو خسرو کی فطرت کا خمیر روز اول ہی سے عشق و محبت کی چاشنی سے گوندھا ہوا تھا لیکن مرشد کی صحبت نے آپ کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ سرمست و شیدائی بنا دیا، بلکہ یوں کہیے کہ دیارِ محبت کا دیوانہ بنا دیا۔ آپ ہر وقت اور ہر لمحہ سایے کی طرح خواجہ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ گویا جناب خواجہ کا جمال پُر جلال دیکھ دیکھ کر جیتے تھے اور جناب خواجہ کو بھی اپنے مرید خسروؒ سے کچھ ایسا ہی دلی تعلق تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہو گا کہ نظام الدین کیا لایا ہے؟ تو جواب میں خسرو کو پیش کر دوں گا۔ دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے۔ ع

الٰہی بہ سوزِ سینہ ایں ترک مرا بہ بخش

ترجمہ: اے اللہ اس ترک کے سوزِ دروں کے طفیل مجھے بخش دے۔

جناب خواجہ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ خواب گاہ میں تشریف لے جاتے تو ملنے والوں کو روک دیا جاتا۔ لیکن خسرو کے لیے بلا تامل چلے آنے کی اجازت تھی۔ خسرو روزانہ آپ سے خواب گاہ میں ملنے آتے اور آپ کے پہلو میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے کہ اتنے میں آپ کی آنکھ لگ جاتی۔ اور یہ بھی پہلو سے اٹھتے اور خواجہ کے قدموں پر سر رکھ کر سو جاتے۔

ایک مرتبہ کئی مہینوں سے یہ صحبت ترک رہی مگر جب پھر سے جاری ہوئی تو خسرو نے یوں اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا۔

نخفت خسرو مسکین ازیں ہوس شبہا
کہ دیدہ برکف پایت نہد بخواب شود

ترجمہ: خسرو غریب اس تمنا میں کئی راتیں نہ سویا کہ حضور کے تلووں

پر آنکھ رکھ کر سوئے۔

خواجہ فرمایا کرتے کہ اگر شریعت اجازت دیتی تو میں اور خسرو ایک ہی قبر میں رہتے۔ آپ خسرو کو ترک اللہ کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ترک معشوق کا لقب تھا خواجہ صاحب فرماتے ہیں سے

گر برائے ترک ترکم ارہ بر تارک نہند
ترک تارک گیرم و ہرگز نگیرم ترکِ ترک

ترجمہ، اگر میری پیشانی پر آرہ رکھ دیا جائے اور کہا جائے کہ اپنے ترک کو چھوڑ دو! تو میں اپنی پیشانی کو چھوڑ دوں گا۔ مگر اپنے ترک کو نہ چھوڑوں گا۔

جناب خسرو اپنے پیرو مرشد جناب خواجہ محبوب الٰہی کے انتقال کے وقت بنگالے میں تھے۔ آپ کی وفات کا سانحہ ناگزیر و المناک سن کر دہلی آئے اور جس وقت اس جگہ پہنچے، جہاں ان دنوں جناب خواجہ کا مزار پُر انوار مرجع خلائق ہے تو آپ نے یہ دوہا پڑھا۔

سے
گوری سوئے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چو دیس

"تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ دوہا کہہ کر آپ نے ایک آہ کا نعرہ مارا اور اسی وقت قفسِ عنصری سے روح پرواز کر گئی۔
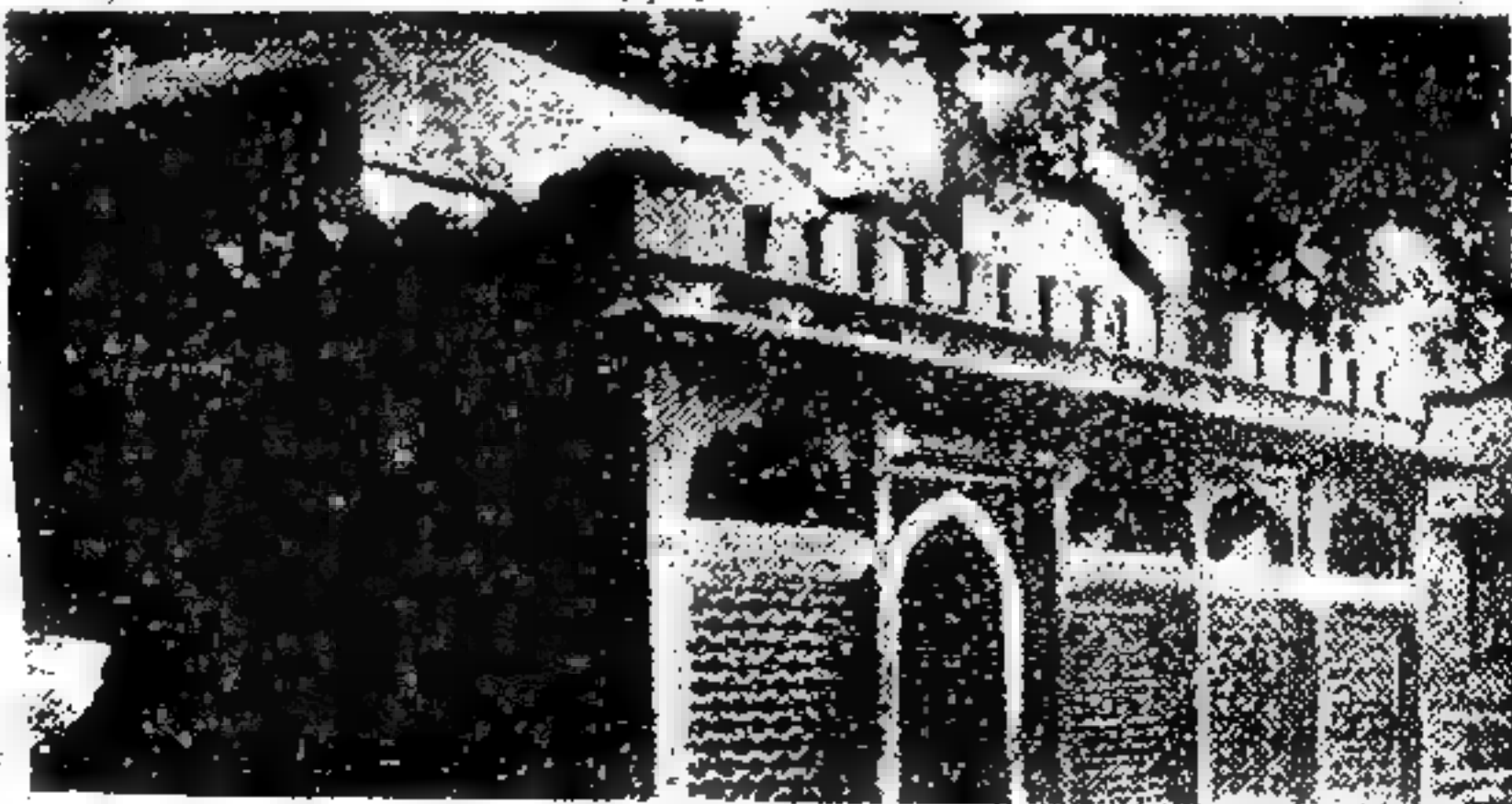
مزار
حضرت
امیر خسروؒ
دہلی
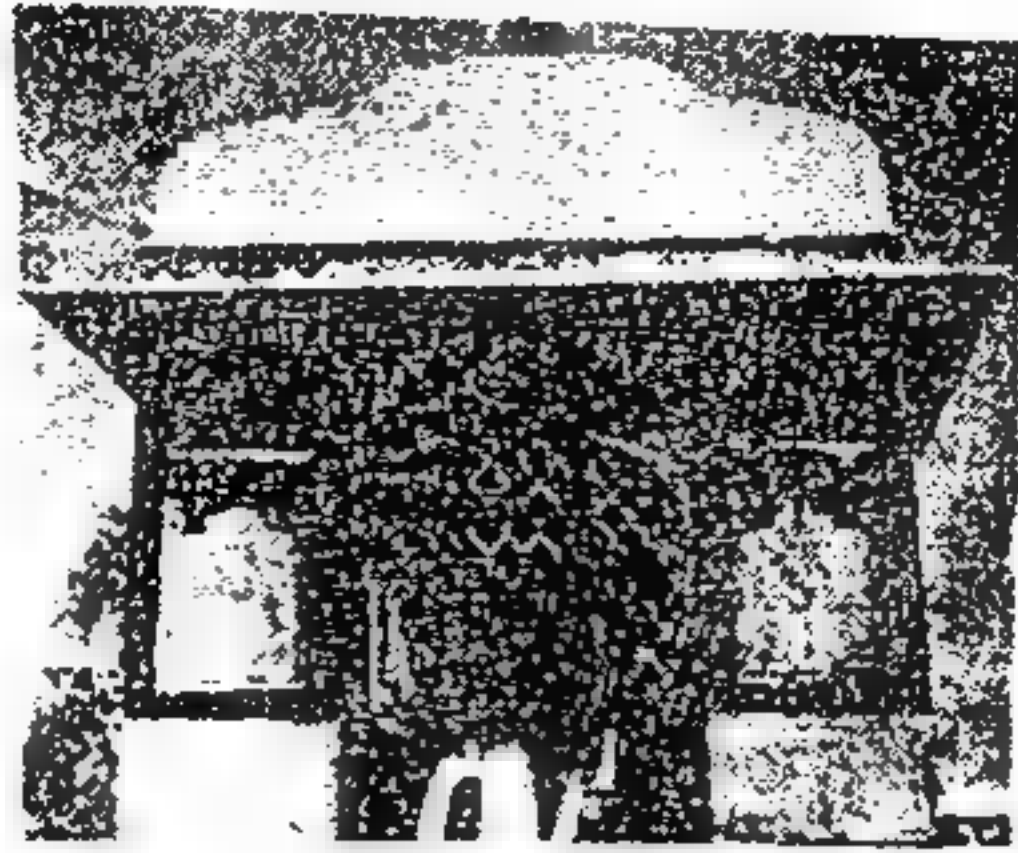
میاں میرؒ

ولادت ۹۳۸ھ یا ۹۵۷ھ میں سہوان (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم قاضی سائیں دتہ فاروقی تمام سندھ میں نہایت معزز و ممتاز بزرگ شمار کیے جاتے تھے۔ تحفۃ الکرام میں لکھا ہے کہ قاضی سائیں دتہ حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد سے تھے اور اپنے وقت کے ممتاز و متبحر علمائے اسلام میں سے تھے۔

آپ کا اسم گرامی شیخ محمد میر تھا مگر میاں میر کے نام سے شہرت پائی۔ آپ ابھی بارہ برس کے تھے کہ آپ کے والد گرامی قدر انتقال فرما گئے آپ کی والدہ محترمہ ایک صاحب علم و عمل خاتون تھیں۔ آپ نے انھیں سلسلہ قادریہ کے سلوک سے روشناس کرایا اور تعلیم دی اس کے بعد آپ قادری سلسلے کے ایک نامور بزرگ جناب شیخ سیوستانی کے مرید ہو گئے۔

آپ ایک طویل عرصے تک جناب شیخ کی خدمت میں حاضر رہے۔ جب آپ کی عمر پچیس برس کی ہوئی تو آپ جناب شیخ کی اجازت سے لاہور آ گئے۔ یہ اکبر کی حکومت کا زمانہ تھا۔ ان دنوں لاہور میں جناب مولانا سعد اللہ درس قرآن حکیم دیا کرتے۔ آپ

ان کے درس میں شامل ہو گئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ چند سال مفتی عبدالسلام لاہوری سے بھی اکتساب علم کیا۔

تکمیل علوم ظاہری و باطنی کے بعد آپ نے خلق خدا کی اصلاح و تبلیغ کا سلسلہ جاری کیا جس سے تھوڑی ہی مدت میں لاہور میں آپ کی شہرت پھیل گئی۔ آپ کو نام و نمود اور شہرت سے چونکہ سخت نفرت تھی اس لیے چند روز کے لیے لاہور سے عازم سرہند ہو گئے۔ ایک سال سرہند میں قیام کرنے کے بعد آپ لاہور میں واپس تشریف لے آئے اور پھر آخر عمر تک یہیں رہے جس مقام پر آپ نے قیام کیا اسے محلہ باغبان کہتے ہیں جسے ان دنوں خانپورہ بھی کہا جاتا ہے۔

آپ نے سرہند سے واپس آکر درس و تدریس کا سلسلہ پھر سے جاری کیا اور ایسے شاگردوں کی بڑی تعداد تیار کی جنھوں نے اسلام پھیلانے میں نمایاں کام کیا۔

آپ اپنے مریدوں اور شاگردوں پر خاص توجہ فرماتے۔ ان کی اصلاح فکر و تہذیب نفس کو مقدم جانتے تھے اور یہ کام چونکہ بڑا سخت ہے اس لیے آپ کسی کو اپنا مرید نہیں بناتے تھے۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ جو شخص آپ کو ملنے کے لیے حاضر ہوتا آپ اس سے بڑی خوش خلقی اور خنداں پیشانی سے پیش آتے اور ان کے حال پر اتنی شفقت فرماتے کہ اسے اس کا سو فیصدی پورا یقین ہو جاتا کہ آپ صرف میرے حال پر ہی کرم فرماتے ہیں لیکن اس کے برعکس تربیت اخلاق اور تزکیہ باطن کے لیے آپ اپنے مریدوں کے احوال پر خاص کر کڑی نظر رکھتے۔ ان سے اگر کوئی خلاف شریعت کام ہو جاتا تو انھیں سختی سے منع کرتے اور آئندہ کے لیے تنبیہ فرما دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے مرید و خلیفہ ملا خواجہ بہاری نے آپ کی خدمت میں ایک واقعہ عرض کیا۔ بہاری نے کہا ایک روز کچھ لوگ میرے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک مکان گر جانے کے آثار پیدا ہوئے۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ فوراً باہر چلے جاؤ۔ سب لوگ اٹھ کر باہر چلے گئے لیکن میں وہیں جم کے بیٹھا رہا اور با آواز بلند کلمہ طیب پڑھتا رہا حتیٰ کہ چھت گری اور دو لکڑیاں آپس میں اس طرح ملیں جن کے درمیان میں سلامتی کے ساتھ بیٹھا ہوا درود و ذکر کرتا رہا جب

ہوا کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ جب تمام طبیب عاجز آ گئے کسی کی دوا کارگر نہ ہوئی تو شاہجہاں مجھے آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا یہ بیٹا کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہے۔ تمام حکیموں نے جواب دے دیا ہے۔ آپ اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں شفا کے لیئے دعا فرمائیں۔ آپ نے یہ سن کر دعا فرمائی اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر وہ پیالہ جس میں خود پانی پیا کرتے تھے۔ پانی سے بھر کر مجھے دیا جسے میں نے پی لیا قدرت خدا کہ چند ہی روز میں بیماری بالکل ہی جاتی رہی اور میں تندرست ہو گیا۔

علامہ اقبال نے اسرار و رموز میں آپ کی شان فقر سے متعلق ایک واقعہ نظم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ ہند آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ایک عرصے سے میں دکن کی مہم میں مصروف ہوں۔ لیکن مہم سر ہونے میں نہیں آتی۔ آپ نے یہ سن کر خاموشی اختیار کی۔ اتفاق سے اسی وقت ایک مرید آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چاندی کے چند سکے آپ کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا۔ میں نے انھیں بڑی محنت و مشقت کے ساتھ جائز طور پر کمایا ہے۔ آپ انھیں بطور نذرانہ قبول فرمالیں۔ آپ نے فرمایا: یہ سکے شہنشاہ ہند کو دے دو جو باوجود بادشاہ ہونے کے اب بھی فقیر و گدا ہے۔ اگرچہ اس کی حکومت چاند، سورج اور ستاروں پر ہے لیکن پھر بھی حرص و ہوس میں گرفتار ہو کر اپنے آپ کو مفلس خیال کرتا ہے۔ دنیا بھر کی دولت میسر آنے کے باوجود اس کی نیت نہیں بھری وہ دوسروں کے دسترخوان پر نظریں جمائے ہوئے اور حرص و ہوس کی بھوک نے اسے تمام جہاں کو ہڑپ کرنے پر آمادہ کیا ہوا ہے۔ اس کی اس ناداری و ضرورت مندی سے خلق خدا سخت پریشان ہے اس کی سطوت اہل دنیا کی دشمن ہے۔ اس کا کارواں نوع انسانی کا رہزن ہے۔ اس کی فکر خام نے لوٹ مار و قتل و غارت گری کا نام تسخیر رکھا ہے خود اس کا لشکر اور اس کے تعلیم کا لشکر اس کی بھوک کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ شاید اُسے معلوم نہیں کہ فقیر کی بھوک کی آگ تو اسی کی حد تک محدود رہتی ہے لیکن بادشاہ کی بھوک کی آگ ملک و ملت سب کو تلف کر دیتی ہے اور شاید اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ

جو شخص غیروں کے لیے تلوار اٹھاتا ہے وہ خود اپنے سینے میں خنجر گھونپتا ہے۔

جناب میاں میر کتاب وسنّت پر عمل کرتے اور حدود شریعت سے قطعاً باہر نہیں جاتے تھے آپ کے اوصاف حمیدہ واخلاق حسنہ کے بارے میں دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ اگر یہ چیزیں بشکل انسان ہوتیں تو یہ جناب میاں میر ہوتے۔

آپ کا لباس ہمیشہ سادہ اور بہت معمولی قیمت کا ہوتا تھا۔ آپ سر پر پگڑی اور ایک موٹے کپڑے کا کرتہ پہنا کرتے تھے۔ مگر صفائی اور پاکیزگی کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ جب کبھی کپڑے میلے ہو جاتے انھیں دریا پر لے جاتے اور خود اپنے ہاتھ سے دھو لیتے۔ مریدین اور معتقدین کو بھی یہی تاکید فرمایا کرتے کہ اپنا کام خود اپنے ہاتھ ہی سے کرنا چاہیے اور لباس میں انھیں خاص طور پر ہدایت کرتے کہ لباس ایسا پہنو جیسا کہ ایک عام آدمی پہنتا ہے جس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ امیر ہے یا غریب۔ خرقہ جو صوفیوں کا خاص لباس ہے آپ نے اس کے پہننے کا مطلق رواج نہیں دیا۔

آپ نے تمام عمر کچھ ایسی گوشہ نشینی وگمنامی پسند فرمائی کہ باوجود اتنے بڑے عالم و فاضل اور صاحب فضل وکمال ہونے کے اپنی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی آپ کے مضامین کی ندرت کو دیکھ کر بڑے بڑے علماء وفضلاء عش عش کر اٹھتے اور نہایت عالمانہ انداز سے مسائل کو ایک ثانیہ کی مہلت میں یوں حل کر کے رکھ دیتے کہ بڑے بڑے علماء دنگ رہ جاتے۔ لیکن اگر کوئی شخص آپ کے مضامین کو قلم بند کرنے کی کوشش کرتا، آپ اسے منع فرما دیتے تھے۔

آپ کے مریدوں کی تعداد بے شمار ہے۔ آپ قادری سلسلے کے بزرگ ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے خلفاء سے فرمایا کہ دیکھو تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کہیں میری ہڈیاں نہ بیچنے لگنا اور میری قبر پر دوسروں کی طرح دکان نہ کھول لینا۔

آپ آخر عمر میں اسہال کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ پانچ دن تک بیمار پڑے رہے۔ ۷ ربیع الاوّل ۱۰۴۵ھ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ آپ نے وفات اسی محلہ خانپور میں اپنے حجرے میں پائی جس میں آخر تک آپ بیٹھے رہے اور وہیں مدفون ہوئے۔
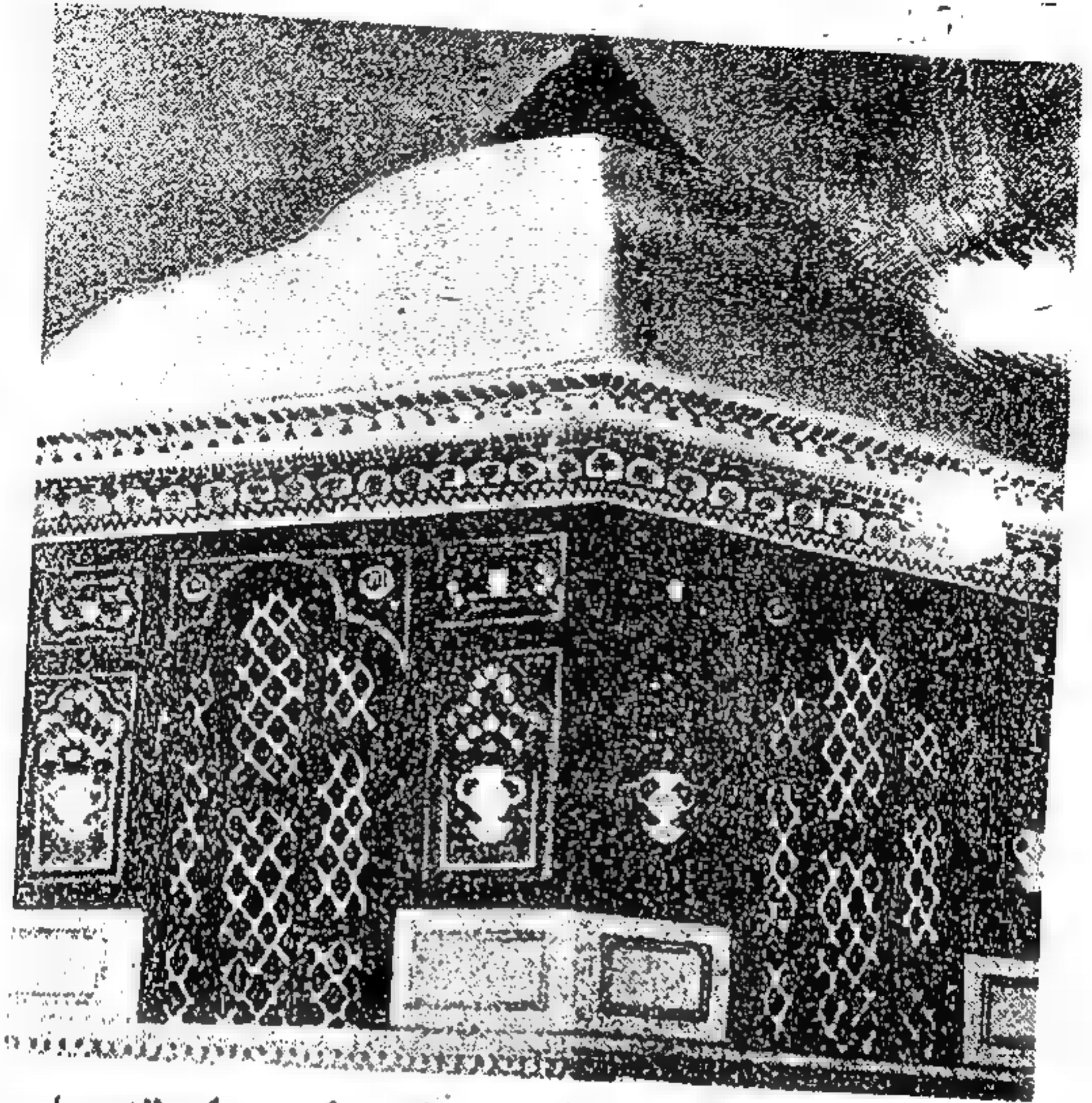
آپ کا مزار اورنگ زیب عالمگیر نے تیار کروایا تھا مگر اس کے مسالے کا اہتمام پہلے سے دارا شکوہ نے کیا تھا کہ اسے موت سے مہلت نہیں ملی اور حکومت کے جھگڑوں میں قتل ہو گیا۔

میاں میرؒ کا مسلک

ہندوستان میں قادری سلسلے کا آغاز سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں جناب سید محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ نے کیا جن کا سلسلۂ نسب نو واسطوں سے جناب شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔

جناب سید محمد غوث ۱۴۷۸ء میں ملتان کے قریب اوچھو نامی ایک مقام پر آ کر مقیم ہوئے۔ اسلام کی تبلیغ شروع کی اور تصوّف کے قادری سلسلے کو فروغ دیا۔ اس زمانے میں وحدت الوجود کے خیالات مسلمانوں میں عام تھے جن کا آگے چل کر نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات کو یکجا کر کے بھگتی کے نام سے ایک مذہبی تحریک جاری ہوئی جس کے بانی بھگت کبیر کہے جاتے ہیں وہ ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے۔

جس زمانے میں جناب مجدد الف ثانی کی عالمگیر شخصیت قادری سلسلے کی راہ سے بالکل ہٹ کر قادریوں کے نظریہ وحدت الوجود کے خلاف اپنے مشہور نظریہ توحید شہودی کو پھیلا رہی تھی اور تصوّف میں ان کا سلسلۂ نقشبندی ہندوستان کے کونے کونے میں فروغ پا رہا تھا۔ جناب میاں میر صاحب جنھوں نے قادری سلسلے کی تعلیم اپنی والدہ محترمہ سے پائی۔ لاہور میں اکیلے، تن تنہا سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر قادری سلسلے کو ترقی دے رہے تھے۔

اگرچہ میاں میر صاحب وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ہر چند یہ نظریہ مغل بادشاہوں کے مزاج کے موافق تھا۔ جہانگیر، شاہجہان اور دارا شکوہ آپ کے مرید تھے اور آپ کا بے حد احترام کرتے تھے لیکن اس سے یہ رائے قائم کرنا کہ چونکہ میاں میر صاحب وحدت الوجود کے قائل تھے اور یہ نظریہ مغلوں کے مزاج سلطنت کے لیے بہت مفید تھا اس لیے وہ آپ کے ارادت مند و عقیدت کیش تھے سراسر بے انصافی ہے۔ درحقیقت یہ نتیجہ آپ کے صلح کل مشرب اختیار کرنے کا تھا، جس نے آپ کو اس قدر جاذبیت و مقبولیت عطا کی کہ اپنے تو اپنے غیروں تک نے آپ کی غلامی کا طوق اپنے زیب گلو کیا جس کی ایک زندہ مثال امرتسر کا دربار صاحب ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جناب میاں میر علیہ الرحمۃ ہی نے سکھوں کی درخواست پر اپنے دست مبارک سے اس کا سنگ بنیاد رکھا یا جیسا کہ ایک مرتبہ جہانگیر نے آپ کو آگرے تشریف لانے کی دعوت دی۔ آپ چلے تو گئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ عرض کرے، آپ نے اس کے سامنے پند و نصائح کے دفتر کھول دیے، پھر جو کچھ آپ نے کہا تھا جب

مزار
پُرانوار۔
حضرت
میاں میرؒ
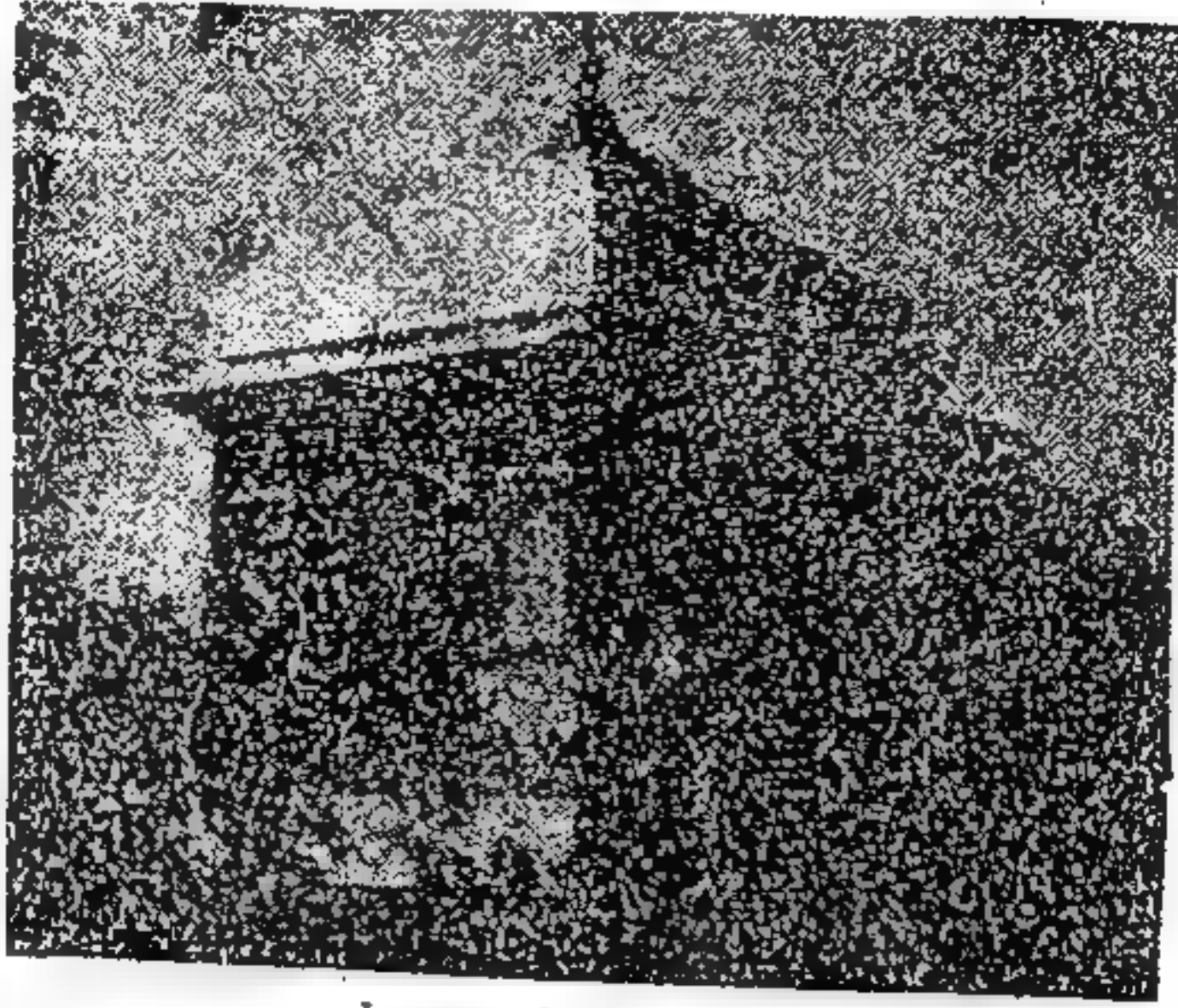
کہہ چکے تو جہانگیر نے عرض کیا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا بس تمہارے لائق فقط ایک ہی خدمت ہے وہ یہ کہ ہم فقیروں کو آئندہ اپنے پاس بلانے کی زحمت نہ دینا۔

شہزادہ دارا شکوہ اپنی کتاب سفینۃ الاولیا میں لکھتا ہے کہ جناب میاں میر صاحب طریقت کے لحاظ سے اپنے زمانے کے جنید تھے۔ کسی کو آسانی سے اپنی ارادت مندی کے حلقے میں داخل نہیں کرتے تھے اور جب کسی کو اپنا مرید بنا لیتے تو اسے منزل مقصود تک پہنچا دیتے تھے۔ آپ کی عادت یہ تھی کہ اپنے مریدوں کو مرید کہنے کی بجائے دوست کہتے۔ جب کسی کو بلانا ہوتا تو فرماتے جاؤ ہمارے فلاں دوست کو بلا لاؤ۔ اور وقت کے حاکموں اور بادشاہوں سے کسی صورت میں بھی نذر و نیاز یا ہدیے اور تحفے قبول نہیں کرتے تھے آپ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

شرط اوّل در طریق عاشقی دانی کہ چیست
ترک کردن ہر دو عالم را و پشت پا زدن

جناب میاں میر کے علاوہ قادری سلسلے کو فروغ دینے والی ایک شخصیت آپ ہی کے زمانے میں جو اور بھی تھی۔ وہ جناب شیخ شاہ ابوالمعالی قادری تھے۔ آپ کا اصل نام سید خیر الدین شاہ تھا۔ ۹۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ سید موسیٰ گیلانی کے ایک مشہور

پیر بھائی شیخ داؤد شیر گڑھی کے جانشین تھے۔ آپ نے لاہور میں شاہ ابوالمعالی کے نام سے شہرت پائی۔ آپ بھیرہ ضلع سرگودھا کے رہنے والے بتائے جاتے ہیں۔

دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ آپ نجیب الطرفین سید تھے۔ قادری سلسلے میں آپ کو شیخ داؤد کرمانی سے نسبت تھی۔ حدیقۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ آپ شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی کے حقیقی بھائی سید رحمت اللہ کے بیٹے ہیں۔ سید رحمت اللہ بن میر سید فتح اللہ کرمانی تین بھائی تھے۔ ایک شیخ داؤد کرمانی، دوسرے سید جلال الدین کرمانی، تیسرے یہی سید رحمت اللہ کرمانی جو شاہ ابوالمعالی قادری کے والد گرامی قدر ہیں۔

شاہ ابوالمعالی اپنے پیر و مرشد روشن ضمیر اور عم محترم جناب شیخ داؤد شیر گڑھی کی خدمت میں تیس برس رہ کر لاہور تشریف لائے اور سلسلہ رشد و ہدایت کا آغاز کیا۔ نیز کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے مرشد کے حکم کے مطابق جب شیر گڑھ سے لاہور کا سفر اختیار کیا تو راستے میں جہاں جہاں آپ ٹھہرے وہاں مسافروں کی سہولت کے لیے جابجا کنوئیں باغیچے اور پختہ تالاب بنواتے چلے گئے۔ اسی پر قیاس کر لیجیے کہ جو لوگ شاہ صاحب کی رہنمائی میں منزل سلوک طے کرتے تھے شاہ صاحب انھیں منزل مقصود پر پہنچانے کا کتنا اچھا اور پیارا اہتمام نہ کرتے ہوں گے۔

شاہ صاحب ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ غربتی اور معالی آپ کا تخلص تھا عربی اور فارسی میں شعر کہتے تھے جن میں اکثر صوفیانہ خیالات ہی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے جناب سید عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں رسالہ غوثیہ اور آپ کی کرامات کے موضوع پر تحفہ قادریہ کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا۔ نیز حلیہ سرور دو عالم گلدستہ باغ ارم، مونس جاں اور زعفران زار اہم کتابیں بھی۔ آپ کی یادگار ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کا ایک قلمی نسخہ "ہشت محفل" کے نام سے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں بھی محفوظ ہے جسے آپ کے صاحبزادے جناب محمد باقر نے مرتب کیا تھا اس نسخے میں شاہ صاحب کے ملفوظات جمع کیے گئے ہیں۔

شاہ صاحب کس پائے کے بزرگ تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ

شیخ عبد الحق محدث دہلوی ایسے بزرگ آپ سے دلی ارادت رکھتے تھے اور باطنی تسکین کے لیے اکثر آپ کی توجہ و دستگیری و رہنمائی کے طالب رہتے تھے اور صرف یہی نہیں کہ جناب شیخ آپ کی سطوت روحانی ہی کے قائل تھے بلکہ اپنے تصنیف و تالیف کے مشغلے میں بھی اکثر آپ کی ہدایات اور مفید مشوروں کے محتاج رہتے تھے۔ مثلاً جناب شیخ نے فتوح الغیب کی شرح آپ ہی کے اصرار پر تحریر کی شرح مشکوٰۃ کی تالیف میں بھی آپ نے کافی ترغیب دی اور طرز نگارش کے بارے میں بھی اکثر مفید مشورے اور ہدایات دیں فرمایا کہ مشکوٰۃ کی شرح میں جا بجا اشعار ہونے چاہئیں، جس سے انداز بیان دلچسپ اور عبارت نہایت موثر ثابت ہو جائے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے بارے میں تمام سیرت نگار اور مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں حدیث کے علم کو ایک باقاعدہ اور منظم صورت میں سب سے پہلے آپ ہی نے عام کیا اور آپ نے علم حدیث کی صرف درس و تدریس ہی کے ذریعے اشاعت نہیں کی بلکہ اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھیں جن میں سے سب سے زیادہ مشہور و مسلّم کتاب لمعات ہے۔

لمعات جو مشکوٰۃ کی شرح ہے جناب شیخ محدث نے چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد مکمل کی۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مدارج النبوۃ کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ جذب القلوب الی دیار المحبوب کے عنوان سے مدینۃ النبی کی تاریخ لکھی۔ جناب شیخ سید عبد القادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا اور آپ کے کلام بلاغت نظام یہ عنوان فتوح الغیب کی شرح لکھی۔ علاوہ ازیں آپ نے اخبار الاخیار کے نام سے بزرگان دین و اولیائے کرام کے سوانح خاص کر جناب عبد القادر جیلانی کی زندگی کے حالات بالتفصیل تحریر کیے۔ نیز دارا شکوہ کی فرمائش پر جناب سید عبد القادر جیلانی کی قدیمی اور مستند سوانح حیات کا زبدۃ الآثار کے نام سے خلاصہ پیش کیا۔

قیاس کیجئے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ایسے بزرگ تسکین قلب اور فیوض

۱۵۹

باطنی کے لیے جس کی توجہ کے طالب اور اکثر دستگیری و رہنمائی کے محتاج رہتے تھے وہ شیخ کس پائے کا مرشد روحانی ہوگا۔ شیخ محدث نے وہ ایک خط جو اپنے فرزند شیخ نورالحق کے نام لکھا تھا اس کے مندرجات سے جناب شیخ کے مرشد کامل شاہ ابو المعالی قادری کے مرتبے کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔ اس خط میں آپ نے اپنے سفر لاہور کی تفصیل تحریر کی ہے اور جناب شاہ ابو المعالی کی توجہ و التفات کے بارے میں روشنی ڈالی ہے کہ وہ ان کی تالیفات و تصنیفات کی تعریف کر کے ان کا دل بڑھاتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنے جلال کی شان بھی دکھاتے ہیں۔ ان کے آنے جانے پر سخت پابندیاں لگا دیتے ہیں۔ شیخ محدث ان کی زیارت کے لیے دہلی سے لاہور آنا چاہتے ہیں تو بہ سختی سے ان کو روک دیتے ہیں۔

سفینۃ الاولیا کے مترجم نے جناب شاہ ابو المعالی کا سن ولادت ۹۲۰ھ لکھا ہے، جو سہو کتابت ہے اور سال وفات ۱۰۲۴ھ تحریر کیا ہے جو صحیح ہے۔ ہم نے دارا شکوہ کی "سفینۃ الاولیا" کا فارسی نسخہ دیکھا ہے جس میں تاریخ ولادت ۹۶۰ھ اور تاریخ وفات ۱۰۲۴ھ درج ہے۔ مفتی غلام سرور نے اپنی کتاب حدیقۃ الاولیا میں بھی سنین لکھے ہیں۔ مفتی صاحب نے جناب شاہ ابو المعالی کی ولادت اور وفات کی منظوم تاریخیں پیش کی ہیں وہ لکھتے ہیں:

بوالمعالی خیر دین احمدی	بود دانش معدن صدق و یقین
سال تولید و ناتش چوں زوال	جست سرور در بندہ بس کزیں
گفت نیکو خیر دین تولید او	رحلتش گفتا معالی خیر دیں
ولادت	**وفات**
۹۶۰ھ	۱۰۲۵ھ

جناب شیخ محدث اور شاہ ابو المعالی قادری کے مختصر سوانح ہم نے برسبیل تذکرہ پیش کیے ہیں۔ گفتگو میاں میر صاحب کے باب میں ہے۔ آخر میں ہمیں جناب شیخ کی سطوت روحانی سے متعلق تھوڑا سا یہ عرض کرنا ہے کہ جن دنوں شہنشاہ جہانگیر

کشمیر میں تھا۔ حاسدوں اور شرپسندوں نے شیخ محدث اور مرزا حسام الدین کے خلاف اس کے کان بھرے۔ جہانگیر نے فوراً ان دونوں کو حاضر ہونے کا حکم بھیجا۔ چنانچہ جب شیخ محدث جہانگیر کے حکم کی تعمیل میں دہلی پہنچنے سے پہلے جناب میاں میر کی خدمت میں لاہور پہنچے اور پریشانی کا اظہار کیا۔ حضرت میاں میر نے فرمایا تمہیں یوں ہی پریشانی ہوگئی اطمینان رکھو کچھ نہیں ہوگا، نہ تمہیں کشمیر جانا پڑے گا، نہ تمہارے بیٹے کو کابل۔ شیخ حسام الدین بھی دہلی میں رہیں گے اور تم لوگ بھی دہلی میں خوش و خرم رہو گے۔ قدرت خدا اس واقعہ کو ابھی دو چار دن بھی نہیں گزرے تھے کہ جہانگیر کا انتقال ہوگیا۔

155

شاہ ابوالمعالی نے پینسٹھ برس کی عمر پائی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی چورانوے سال دو مہینے حیات رہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے قریب دہلی میں مدفون ہوئے۔ میاں میر صاحب نے اٹھاسی برس کی عمر میں اس دنیائے فانی سے آخرت کا سفر اختیار کیا۔
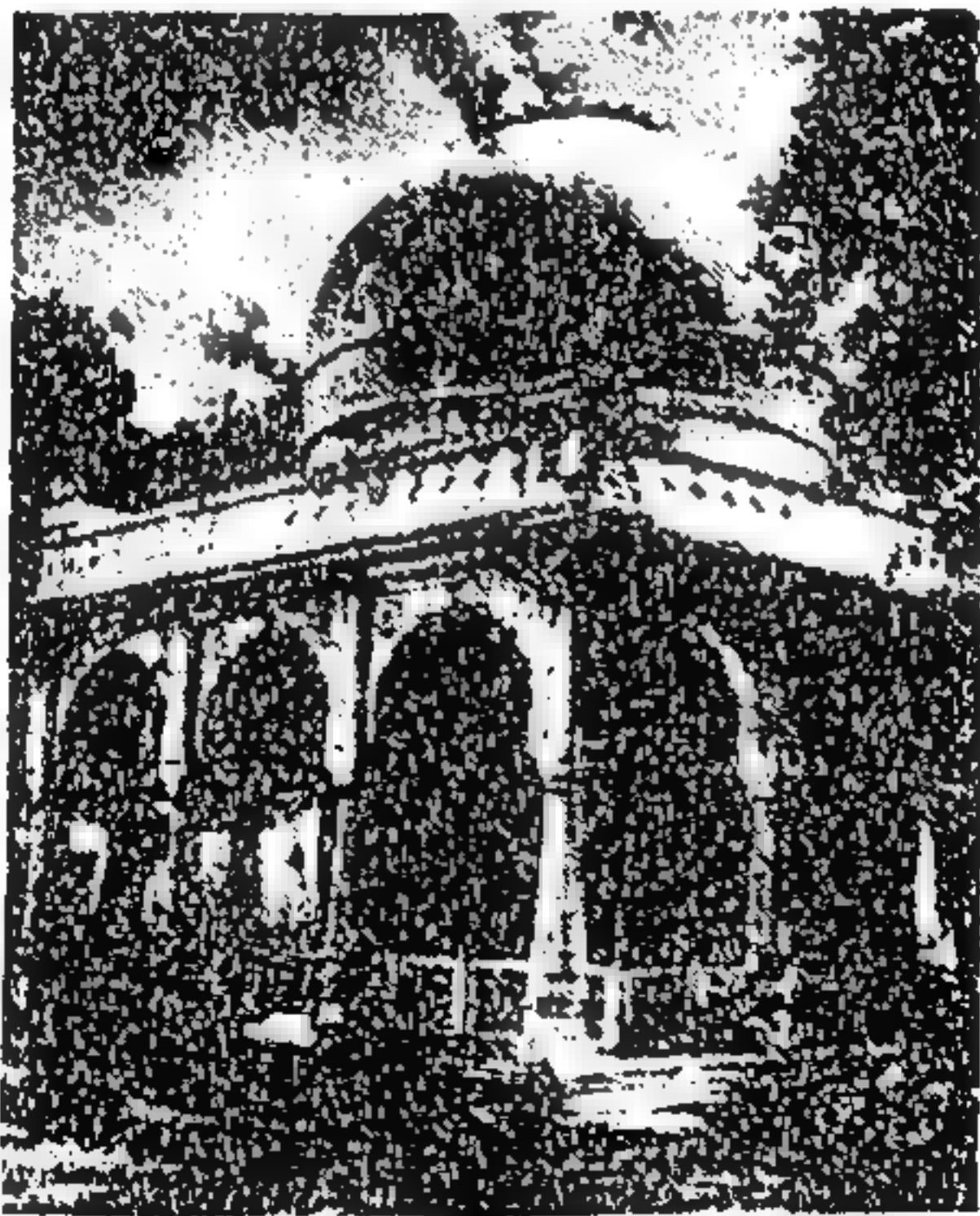
مزار مقدسہ
حضرت
قطب الاقطاب
مہرولی
(دہلی)
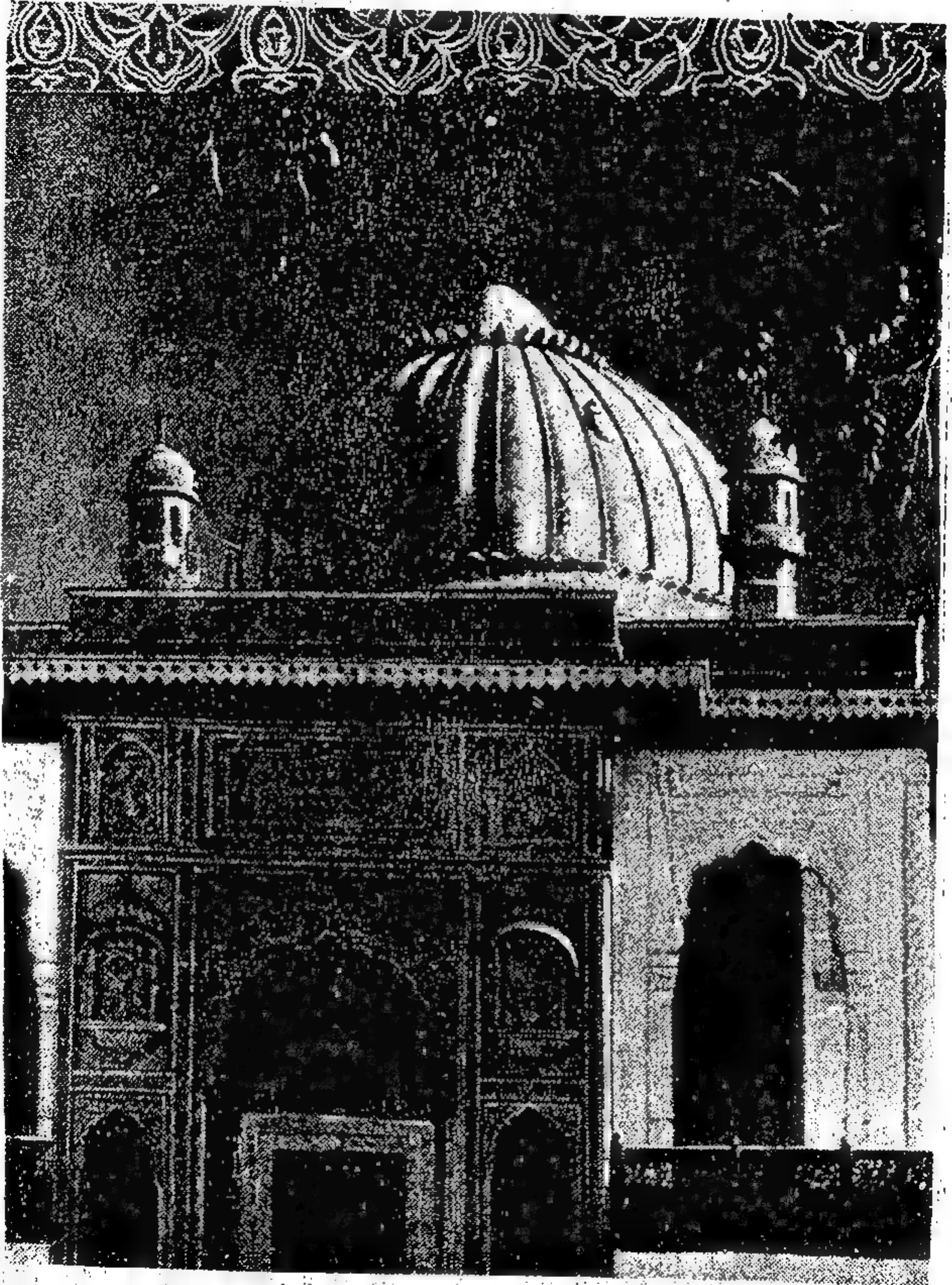
سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے سالار حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا مزارِ مبارک (سرہند شریف)
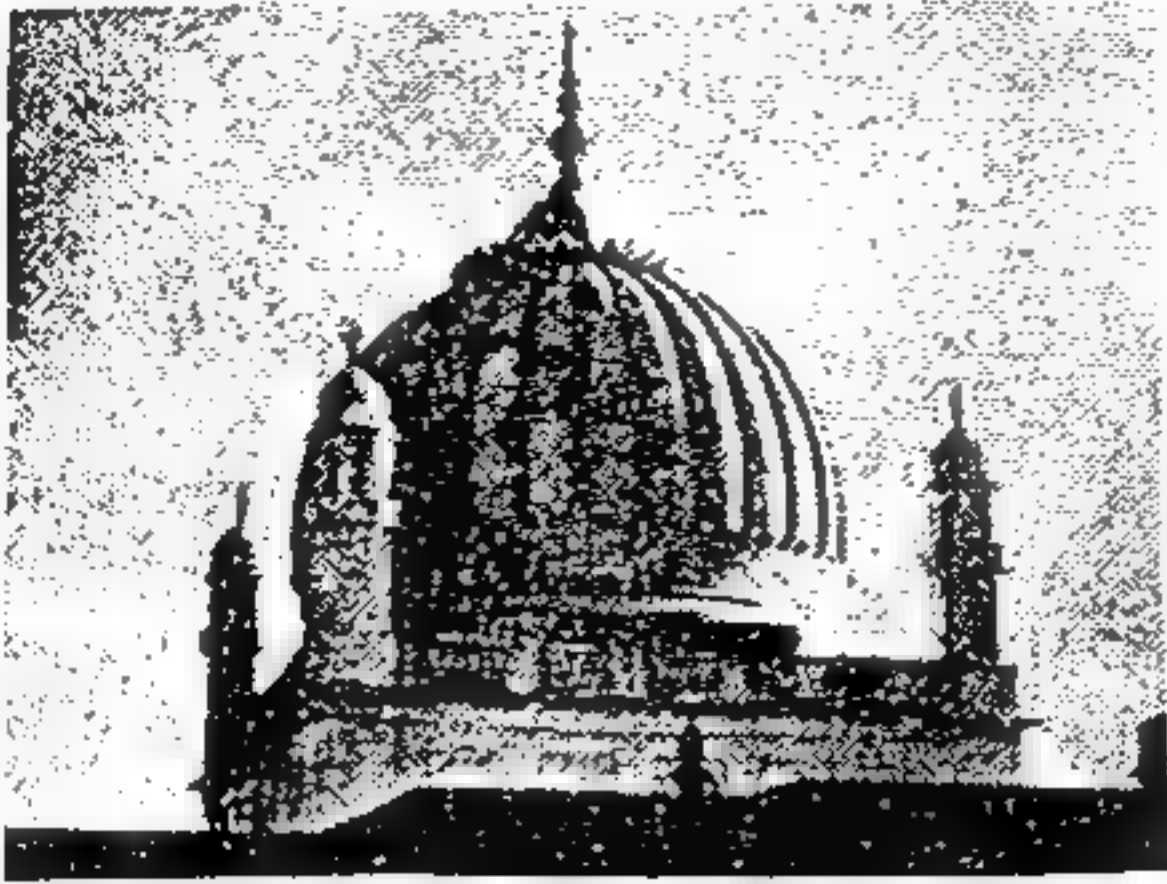
حضرت مجدّد الف ثانیؒ

ولادت ۹۷۱ھ سرہند میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں یہ مقام ایک جنگل تھا جس میں شیر رہا کرتے تھے۔ جب یہاں شہر آباد کیا گیا تو اسی مناسبت سے اس کا نام "شیر ہند" تجویز ہوا جو آگے چل کر "شیر ہند" سے بگڑتے بگڑتے سرہند بن گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اسی سرہند میں جناب عمر فاروقؓ کی ایک اولاد کو لا کر یہاں آباد کر دیا۔ جن کے بزرگ محترم جناب شیخ عبد الاحد فاروقی سلسلہ چشت کے ایک عالم باعمل بزرگ تھے۔ یہی بزرگ جناب شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے والد گرامی قدر تھے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے پائی۔ ان کے علاوہ آپ نے دیگر علمائے اسلام کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مبداء فیاض نے آپ کو کچھ ایسا ذہن رسا عطا فرمایا تھا کہ جملہ اسلامی علوم بہ تمام و کمال سترہ برس کی عمر تک حاصل ہی نہیں کیے بلکہ ان میں کمال تبحر پیدا کر لیا اور آپ نے قرآن حکیم حفظ کیا۔ پھر فقہ، حدیث و تفسیر و دیگر اسلامی علوم

حاصل کیے۔ غرض نہایت ہی قلیل مدّت میں آپ ایک متبحر عالم دین ہو گئے۔

علوم ظاہری و باطنی میں تکمیل پانے کے بعد آپ کے والد مولانا شیخ عبدالاحد فاروقی نے آپ کو خرقہ خلافت عطا فرمایا اور اس امانت کے سونپنے کے بعد مولانا عالم جاوِدانی کو رحلت فرما گئے۔

والد کے انتقال کے بعد آپ حج کے ارادے سے دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں ایک بزرگ کے ہاں قیام کیا۔ انھوں نے ایک عارف کامل جناب خواجہ باقی باللہؒ نقشبندی کا آپ سے ذکر کیا۔ آپ کو ان کے فضائل سُن کر ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا چنانچہ آپ ان کے ہمراہ جناب خواجہ باقی باللہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مختصراً یہ کہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت مسرور ہوئے اور دونوں ان بزرگ سے آپس میں ایک دوسرے کی ملاقات کرانے کے شکر گزار تھے خواجہ باقی باللہ کا طرزِ عمل آپ سے نہایت مخلصانہ و مشفقانہ رہا۔ انھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا کہ یہ جناب شیخ احمد کے مرید ہیں۔ حالانکہ جناب شیخ احمد سرہندی جناب خواجہ باقی باللہ کے مرید تھے۔

خواجہ باقی باللہ آپ کا بڑا احترام کرتے اور آپ سے دلی محبّت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے آپ سے فرمایا۔ ہم نے یہاں سرہند میں ایک بہت بڑا چراغ روشن کیا۔ اس کی روشنی یک لخت بڑھنے لگی۔ پھر ہمارے جلائے ہوئے چراغ سے بیسیوں چراغ روشن ہو گئے اور وہ چراغ تم ہو۔

دسویں صدی ہجری، اکبر کے زمانے میں اسلام ایک ایسے دور سے دوچار تھا جس میں کفر و زندقہ و الحاد نقطہ عروج پر تھا۔ ایک طرف علمائے اسلام کے آپس میں خرخشے، ایک دوسرے پر حملے، شدید باہمی رقابتیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی زمام اقتدار اکبر جیسے بے علم و بے دین بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ جسے ملک پر حکومت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نئے مذہب کا بانی بن کر لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کی خواہش بھی تھی۔

اکبر نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسی چال چلی جسے آج ہمارے زمانے کی زبان میں ڈپلومیسی کہتے ہیں۔ وہ ہر مذہب و ملّت کے شخص کی دل جوئی کرتا اور اس

کے مذہب کو برحق سمجھتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت چالاکی سے اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کرتا کہ اب زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات وخیالات اور تقاضوں کے پیش نظر یہ مذہب ختم ہوگیا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔

اکبر چاہتا تھا کہ ہندوستان کے تمام مذاہب کو مٹا کر ایک نیا مذہب قائم کیا جائے جس میں تمام مذاہب کے لوگ اپنا اپنا دین و مذہب ترک کر کے شامل ہوں اور اس کی سلطنت کے استحکام کا باعث بنیں۔ چنانچہ ملّا مبارک جو اپنے زمانے کا ایک متبحر عالم تھا۔ دین کو چھوڑ کر دنیا کی طلب میں اکبر کے فاسد خیالات کا سرگرم کارکن بن گیا۔ اکبر ایسے بے علم بادشاہ نے ملّا مبارک جیسے عالم و فاضل انسان کی تائید و حمایت پاکر "دین الٰہی" کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھ دی اور اس میں داخل ہونے والوں کے لیے ایک عہد نامہ ترتیب دیا۔ جس کے الفاظ یہ تھے :۔

"میں فلاں ابن فلاں اپنی ذاتی خواہش و رغبت اور دلی شوق و ذوق سے اسلام مجازی و تقلیدی کو ترک کر کے اکبر کے "دین الٰہی" میں، داخل ہوتا ہوں اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبے قبول کرتا ہوں۔ یعنی ترک مال، ترک جان، ترک عزت و ناموس اور ترک دین کا اقرار کرتا ہوں۔"

اکبر کے دین الٰہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سورج کی پرستش چار وقت لازمی قرار دی گئی، آگ، پانی، درخت اور گائے وغیرہ کا پوجنا جائز ہوگیا۔ ماتھے پر قشقہ لگانا، گلے میں زنار پہننا مذہب حقّہ کی علامت بن گیا۔ ان کے علاوہ داڑھی منڈوانا، غسل جنابت نہ کرنا، ختنہ کی رسم کو بیکار و باعث آزار سمجھ کر ترک کرنا۔ دین الٰہی کے ماننے والوں کی شناخت قرار پائی۔

غرض تمام شعائر اسلامی کو یہ کہہ کر ترک کر دیا کہ دین اسلام ایک ہزار برس گزر جانے کے بعد بالکل اسی طرح بیکار و بے مصرف ہوگیا جس طرح اسلام سے پہلے کے مذاہب اپنے ہزار سال گزرنے کے بعد عضو معطل کی طرح ختم ہوگئے۔

اصل میں اکبر شروع شروع میں ایک مسلمان آدمی تھا لیکن بعد میں جوں جوں غیر مسلموں سے اس کا میل جول بڑھتا گیا حتیٰ کہ ان سے اس کے رشتے ناطے ہونے لگے توں توں

ان کے اختلاط کے اثر سے وہ غیر مسلموں کے قریب سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ وہ اسلامی روایات جو اس کے بزرگوں نے قائم کی تھیں۔ وہ غیر مسلموں سے گہرے اختلاط کے سبب ایک ایک کر کے مٹنے لگیں۔

ایسے حالات میں ضرورت تھی کہ ایک عارف کامل اور مرد مجاہد کی جو اسلام کی مدافعت میں سینہ سپر ہو کر باطل کی قوتوں کے سامنے کھڑا ہو جاتے اور سینے میں وہ عزم و جوش اور ولولہ پیدا کر کے میدانِ عمل میں آگے بڑھے کہ اس کی ہیبت وصولت سے قدم قدم پر کامرانی اس کی قدم بوسی کرے۔

اِن دنوں اکبر کا دار الحکومت بجائے دہلی کے آگرہ ہوتا تھا اور اس زمانے میں آگرہ کا نام اکبر آباد تھا۔ جناب شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہند سے آگرے کو روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر آپ نے بڑی دلیری و بے باکی سے اکبر کے درباریوں سے فرمایا۔

اے لوگو! تمہارا بادشاہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے پھر گیا اور اللہ کے دین سے باغی ہو گیا ہے جاؤ اسے میری طرف سے جا کر کہہ دو کہ دنیا کی یہ دولت حشمت اور تخت و تاج سب فانی ہیں۔ وہ توبہ کر کے خدا اور اس کے رسول کے دین میں داخل ہو جاتے اور ان کی اطاعت کرے۔ ورنہ اللہ کے غضب کا انتظار کرے۔

دُنیا کو دین پر ترجیح دینے والے علماء اکبر کی طرف تھے۔ دُنیا کو دین پر قربان کرنے والے چند بوریہ نشین اصحاب آپ کے ساتھ۔ مباحثہ کا انتظام ہو چکا تھا۔ مگر کارکنانِ قضا و قدر کو منظور نہیں تھا کہ اکبر ایسے بے علم و بے دین بادشاہ کے دربار میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر مر مٹنے والوں کی رسوائی ہو۔ ابھی مباحثے کا آغاز ہونے بھی نہ پایا تھا کہ ہوا کا ایک سخت طوفان آیا اور تمام دربار اکبری تہ و بالا ہو گیا۔ خیموں کی چوبیں اتنے زور سے اکھڑیں کہ ہزار کوششوں کے باوجود پھر انھیں سنبھالا نہ جا سکا۔

قدرتِ خدا کہ اکبر اور اس کے تمام ساتھی تو زخمی ہو گئے۔ لیکن جناب شیخ اور

ان کے درویشوں میں سے کسی کو ایک خراش تک نہ پہنچی۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ انہی زخموں کی وجہ سے جو مباحثہ کے دن خیموں کی چوبوں سے اکبر کو آئے اکبر کی موت واقع ہوئی۔ نیز لکھا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے عقائد سے تائب ہوا اور بستر مرگ پر نئے سرے سے اسلام قبول کر کے دنیا سے گیا۔

اکبر کے مرنے کے بعد اب آپ کا دوسرا محاذ ان دنیا پرستوں کے خلاف قائم ہوا جن کی خوشامد، چاپلوسی اور بے جا تعریف سے اکبر عقل سلیم سے محروم ہو کر دین الٰہی کے قائم کرنے کا مدعی ہوا۔ ان لوگوں میں علماء و فضلاء بھی شامل تھے جن کے اغراض محض سیاسی تھے۔

اب ہندوستان کے تخت پر اگرچہ شہنشاہ نورالدین جہانگیر بیٹھا تھا تاہم حکم اس کی ملکہ نورجہاں کا چلتا تھا۔ جہانگیر خود کہا کرتا تھا "ہم نے ایک سیر شراب اور آدھا سیر گوشت کے عوض سلطنت نورجہاں کو دے دی۔"

اللہ کے جن بندوں کو آداب سحرگاہی آتے ہیں وہ آداب شاہی کی کبھی پروا نہیں کرتے۔ ایک طرف ہندوستان کا طاقتور بادشاہ اکبر دوسری طرف اکبر کی حکومت سے ٹکر لینے والا اللہ کا وہ نیک بندہ جو بظاہر ایک بوریہ نشین سے زیادہ [...]ت نہیں رکھتا تھا یہ معرکہ لوگوں کی نگاہ میں بڑی اہمیت حاصل کر گیا حکومت [...]ے بڑے ارکین سے معمولی سے معمولی آدمی تک سب کے دلوں میں آپ کی [ح]ق گوئی و بے باکی نے آپ کی شخصی عظمت، علمی فضیلت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی روحانی قوت کا رعب و جلال بٹھا دیا۔ ایک خلق خدا آپ کے حلقۂ ارادت [م]ندی میں داخل ہو گئی۔

دنیا[...] لوگوں کے گروہ نے جس نے دین کے عالموں کا لبادہ پہن کر بادشاہ [...]ر رفاقت اختیار کی۔ آپ کی دن بدن بڑھتی ہوئی مقبولیت کو اپنے لیے [م]ہلک محسوس کیا۔ چنانچہ وہ آپ سے حسد کرنے اور آپ کے اثر و نفوذ کو کم [کر]نے کے لیے آپ کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کے

مکتوبات کی تحریف کرکے انھیں لوگوں میں پھیلانا شروع کر دیا۔

آخر ان بد باطن لوگوں کی کارروائیوں نے یہاں تک اثر کیا کہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی ایسے بزرگ ان کی باتوں میں آگئے اور انھوں نے آپ کے خلاف کتابیں لکھیں اور آپ کے قتل کا فتویٰ دے دیا جس کا انھیں بعد میں عمر بھر قلق رہا۔

حاسدوں نے آپ کے خلاف جہانگیر کے کان بھرنے کے لیے نور جہاں کو آلۂ کار بنایا۔ نور جہاں چونکہ اپنے بھائی آصف جاہ کو ولی عہد سلطنت بنانے کے خواب دیکھ رہی تھی اور یہ لوگ اس کی تائید میں تھے۔ اس لیے اس آرزو کی تکمیل کے لیے اس سے جہاں تک بھی ممکن ہو سکا تھا اس نے جہانگیر کو آپ کے خلاف خوب اکسایا۔

آخر چند غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر جہانگیر نے آپ کو دربار میں طلب کر لیا۔ آپ تشریف لے گئے۔ وہاں چند سوال و جواب ہوئے۔ آپ کے طرزِ کلام میں چونکہ کوئی ایسی بات پیدا نہ ہوئی جو قابلِ مواخذہ ہو۔ لہٰذا سلامتی کے ساتھ واپس آگئے۔

بد باطن لوگوں نے دیکھا کہ ان کا پہلا وار ناکام گیا۔ اب انھوں نے دوسرا حربہ یہ اختیار کیا کہ جہانگیر کی نظر سے وہ کتابیں گزاریں جو غلط فہمیوں میں پڑ کر شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے آپ کے خلاف لکھی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے آپ کی طرف اشارہ کر کے جہانگیر سے یہ بھی کہا کہ یہ شخص آپ کی حکومت کے لیے سخت خطرناک ہے۔ سجدۂ دربار جو اکبر بادشاہ کے زمانے سے رائج چلا آرہا ہے یہ اس کے خلاف اپنا فتویٰ دے چکا ہے۔ اس کے پاس اس وقت کم و بیش دو ہزار سوار موجود ہیں جو کسی وقت بھی آپ کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔

حاسدوں نے سوچا کہ ہماری یہ چال دوہرا کام کرے گی یعنی اگر آپ نے بادشاہ کو سجدہ نہ کیا تو بادشاہ کے عتاب میں آجائیں گے اور اگر کر دیا تو اپنے مریدین سے جائیں گے ان کے دلوں میں آپ کی فضیلت و عظمت مطلق باقی نہ رہے گی۔

جہانگیر کو مذہب کے معاملے میں حکومت زیادہ پیاری تھی۔ وہ یہ باتیں سن کر تلملا اٹھا۔ اس نے فوراً آپ کو دربار میں طلب کیا۔ آپ تشریف لے گئے۔ لیکن سجدہ

مقبرہ جہانگیر کا ایک منظر
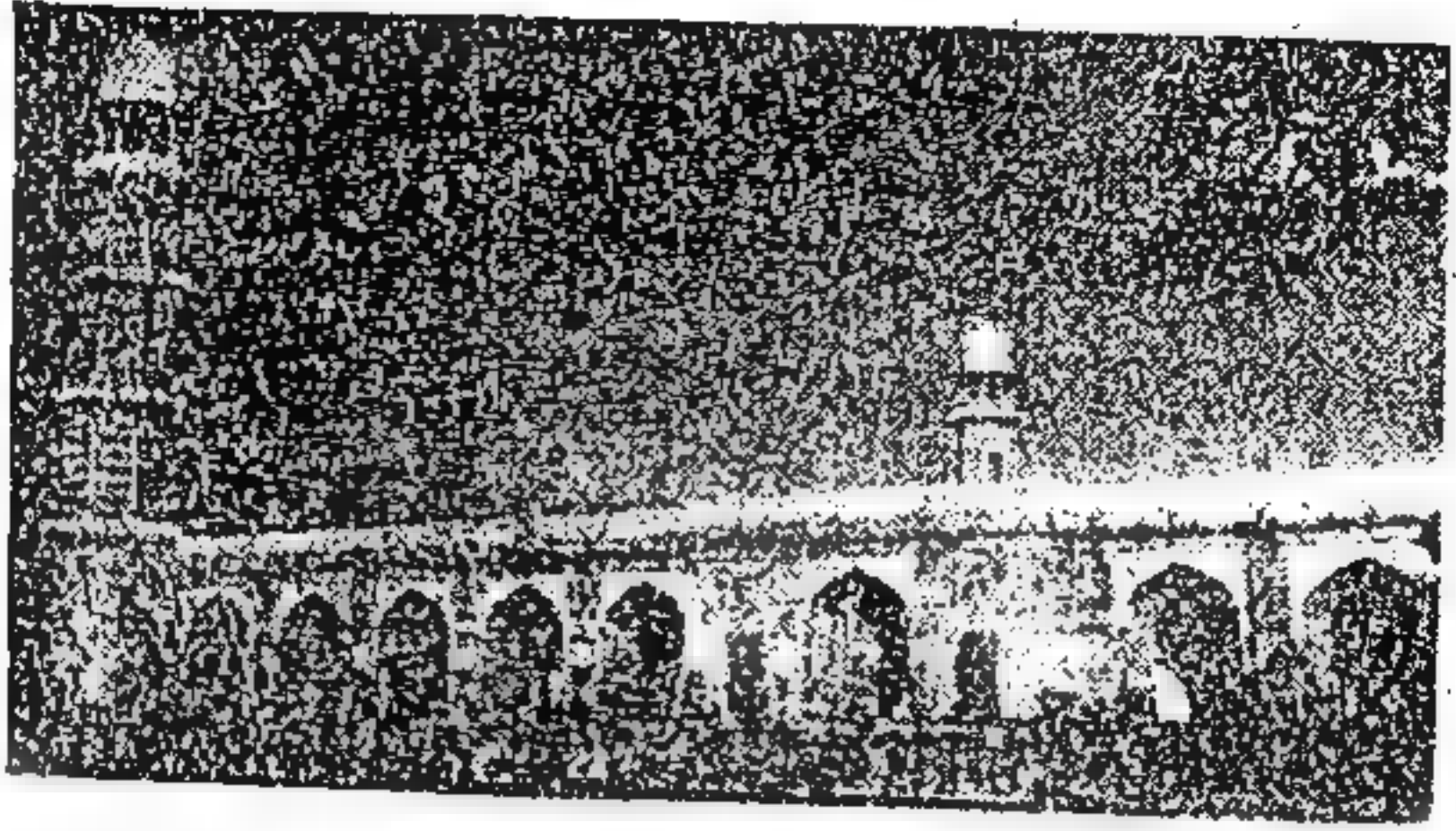
شاہی جس کا وہ طالب تھا قطعاً ادا نہ کیا۔ اس پر جہانگیر غضب ناک ہوا۔
آپ نے جہانگیر سے بڑی دلیری کے ساتھ پوچھا۔ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ اپنے لیے سجدہ تعظیم! اللہ کا بندہ کبھی غیر کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ جو حاکموں کے حاکم کی بارگاہ میں سر جھکائے وہ کبھی کسی جھوٹے اور مٹ جانے والے حاکم کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔ بھلا میں اپنے ہی جیسے ایک مجبور و بے بس انسان کو سجدہ کروں ہرگز نہیں۔ کیونکہ سجدہ خدا کے سوا کسی کو جائز نہیں۔
جہانگیر آپ کے یہ کلمات حق سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے غصے کی انتہا نہ رہی اس کے خیال و گمان میں کبھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی شخص اتنی دلیری؛ بے باکی اور جرأت کے ساتھ اس سے گفتگو کرے گا۔ اس نے فوراً آپ کے قتل کیے جانے کا حکم دے دیا۔ اللہ اکبر۔
مگر حکم پاکر آپ کے چہرے پر مطلق کسی پریشانی اور خوف و ہراس کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ نہایت استقلال اور حوصلے کے ساتھ وہیں کھڑے رہے۔ مگر اس مقلوب القلب کی حکمت دیکھیے کہ تھوڑی ہی دیر میں جہانگیر نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور بجائے قتل کے قید کیے جانے کا حکم دیا۔
چنانچہ آپ قید کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ جہانگیر کے حکم سے آپ کا گھر بار بھی لوٹا گیا۔ یہ وقت اصل میں وہ تھا جس کی پیش گوئی آپ قید ہونے سے بہت

پہلے اپنے درویشوں، مریدوں اور معتقدوں سے کر چکے تھے۔

آپ کے قید کیے جانے کی اطلاع پا کر سب سے پہلے شاہجہاں نے آپ سے رجوع کیا۔ اس نے اپنے خاص الخاص معتمد افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن کو آپ کی خدمت میں بھیجا اور فقہ کی وہ کتابیں جن میں سجدہ تعظیمی کی اباحت کی گئی تھی۔ ہمراہ بھیجیں اور کہلا بھیجا کہ اگر آپ بادشاہ سے ملاقات کے وقت سجدۂ تعظیمی کر لیں تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو مطلق کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔

آپ نے شاہجہاں کے پیغام میں اسے یہ جواب ارشاد فرمایا کہ اگرچہ جان بچانے کے لیے یہ بھی جائز ہے۔ لیکن عزیمت اسی میں ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے۔

جہانگیر نے حکومت کے بڑے بڑے ارکین کو آپ کے قید کیے جانے سے پہلے ہی مختلف علاقوں کے گورنر بنا کر ادھر اُدھر بھیج دیا تھا۔ مصلحت اس کے نزدیک یہ تھی کہ آپ کے اوپر گرفت کرنے میں اسے آسانی رہے۔ لیکن جب ان گورنروں کو آپ کی گرفتاری کا علم ہوا تو سب نے آپس میں ایکا کر کے جہانگیر کے خلاف بغاوت کر دی۔ حتیٰ کہ مہابت خاں، مرتضیٰ خاں، تربیت خاں، سید صدر جہاں، اسلام خاں، خان جہاں لودھی، حیات خاں، دریا خاں، غرض آپ کے تمام معتقدین جہانگیر کے مقابلے کو نکل آئے۔

مہابت خاں نے بادشاہان بدخشاں و خراسان اور توران سے امداد لے کر جہانگیر پر لشکر کشی کا حکم دے دیا۔ جہانگیر بھی اپنی فوج و سپاہ لے کر مقابلے کو نکلا۔ ابھی دونوں لشکر مقابلے پر آئے ہی تھے کہ جہانگیر کے لشکر سے بہت سے آدمی مہابت خاں سے جا ملے۔ آخر جہانگیر اور آصف جاہ دونوں کو مہابت خاں نے گرفتار کر لیا اور خطبے اور سکے سے اس کا نام نکال باہر کیا۔

اس کے بعد مہابت خاں نے آپ کی خدمت میں واقعات کی تفصیل عرض کی اور درخواست کی کہ ہماری خواہش ہے کہ مغل سلطنت کے تخت شاہی پر اب آپ جلوہ افروز ہوں۔ آپ نے اس کے جواب میں مہابت خاں کو لکھا۔ مجھے سلطنت پانے

اور حکومت کرنے کی ہرگز ہوس نہیں۔ اور میں تمھارے اس فتنہ و فساد کو پسند نہیں کرتا۔ میں نے جو قید و بند کی صعوبتیں اٹھائی ہیں وہ کسی اور مقصد کے لیے ہیں۔ وہ مقصد جب پورا ہو جائے گا تو میں آپ سے آپ قید سے رہائی پا لوں گا۔ یہ فساد میرے مقصد میں حائل ہے۔ بہتر ہے کہ تم بغاوت سے باز آجاؤ اور فوراً اپنے بادشاہ کی اطاعت قبول کر لو۔ میں بھی انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہی قید سے رہائی پا لوں گا۔

اسی اثنا میں نورجہاں کو بھی گرفتار کیا جا چکا تھا جو جہانگیر و آصف جاہ کی گرفتاری کی اطلاع پر انہیں چھڑانے آئی تھی۔ قریب تھا کہ مہابت خاں کے غیظ و غضب سے یہ تینوں اپنے کیے کی سزا پا لیتے کہ آپ کا خط آ گیا جس میں گرفتار شدگان کو رہا کرنے کا حکم تھا چنانچہ مہابت خاں نے مرشد کے حکم کی تعمیل کی۔ مہابت خاں جہانگیر کے پاس آیا اور کہا میں آپ کو اپنے مرشد کے حکم سے رہا کرتا ہوں اور اس کے بعد وہ جہانگیر کو تخت شاہی پر بٹھا کر تمام آداب شاہی بجا لایا۔

تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ آپ کامل ایک برس تک زنداں میں پڑے رہے۔ جہانگیر نے جب دیکھا کہ ان کے مریدوں نے جوشِ محبت میں آکر بغاوت لی اور قریب تھا کہ سلطنت مغلیہ کا چراغ گل کر دیا جاتا مگر ایسے حالات میں بھی آپ نے سلطنت سے کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ آپ نے اپنے مریدوں کو بغاوت ہی سے روک دیا تو اس کے دل سے بدکردار لوگوں کے پیدا کیے ہوئے آپ کے خلاف شکوک و شبہات جاتے رہے اور اس نے آپ کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ رہا کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے ہو جاتے ہیں اللہ ان کا ہو جاتا ہے پھر بھلا ان کی نگاہوں میں دنیا کی کیا قدر و قیمت رہتی ہے۔ جہانگیر نے واقعات کی روشنی میں ایک طرف آپ کی بے نفسی دیکھی تو دوسری طرف نورجہاں اور اس کے بھائی آصف جاہ کی سازشوں کو دیکھ لیا۔

جناب شیخ سرہندی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے، آصف جاہ اور نورجہاں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس کے بعد جہانگیر کو آپ سے اتنی عقیدت پیدا ہوئی کہ کشمیر سے

آتے جاتے دو مرتبہ آپ کے لنگر یا باورچی خانے سے کھانا کھانے کی سعادت حاصل کرتا. اگرچہ کھانا سادہ ہوتا لیکن وہ تعریف کیے بغیر نہ رہتا اور کہتا میں نے ایسا لذیذ کھانا آج تک نہیں کھایا۔

/تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جہانگیر آخیر عمر میں اکثر یہ بات کہا کرتا کہ میں نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے نجات کی امید ہو. البتہ میرے پاس یہ ایک دستاویز ہے کہ مجھ سے ایک روز جناب شیخ احمد سرہندی نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں جنت میں لے گیا تو ہم تمہارے بغیر نہ جائیں گے۔/

غرض یہ تھے وہ احوال مسلمانوں اور برائے نام مسلمان حکومت کے جن میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں کے ایمان کی تجدید کرنے کا موقع دیا اور آپ کو الف ثانی کا مجدد بنایا.

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ آپ نقشبندی سلسلے کے بزرگ خواجہ باقی اللہ کے مرید ہوئے۔ اس لیے آپ سے تصوف کا جو سلسلہ آگے چلا اسے مجددیہ نقشبندیہ کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جناب خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سے شروع ہوتا ہے" تذکرہ نگاروں نے اس کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی ہے کہ وہ کپڑے پر نقش و نگار اور گل بوٹے نکالنے کا کام کرتے تھے۔)

شجرہ نقشبندیہ

(۱) جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
(۲) جناب ابو بکر صدیق رض
(۳) جناب سلمان فارسی رض
(۴) قاسم بن امام محمد ابن ابو بکر صدیق رض
(۵) امام جعفر صادق
(۶) حضرت بایزید بسطامی
(۷) حضرت خواجہ ابو الحسن خرقانی

(۸) ابوالقاسم گرگانی
(۹) خواجہ ابو اعلیٰ فارمدی
(۱۰) خواجہ یوسف ہمدانی
(۱۱) خواجہ عبدالخالق غجدوانی
(۱۲) خواجہ عارف کریوی
(۱۳) خواجہ محمود ابوالخیر فغنوی
(۱۴) خواجہ عزیز العلی رام تینی
(۱۵) خواجہ محمد بابا سماسی
(۱۶) خواجہ سید امیر کلاں
(۱۷) خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی بانی سلسلہ نقشبندیہ
(۱۸) خواجہ علاؤ الدین
(۱۹) خواجہ یعقوب چرخی
(۲۰) خواجہ عبیداللہ احرار
(۲۱) خواجہ محمد زاہد
(۲۲) خواجہ درویش محمد
(۲۳) خواجہ محمد امکنگی ۔
(۲۴) خواجہ محمد عرف باقی باللہ
(۲۵) امام ربانی جناب شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ

تصانیف

۱۔ مکتوبات
۲۔ مبداء و معاد
۳۔ معارف لدنیہ

۴. مکاشفات غیبیہ
۵. شرح رباعیات حضرت خواجہ باقی باللہ
۶. رسالہ تہلیلیہ
۷. رسالہ فی اثبات النبوت
۸. رسالہ سلسلہ احادیث

اولاد: آٹھ لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔

آپ کو اکثر جوڑوں کے درد کی شکایت رہی۔ شاید یہ مرض ایام قید میں لاحق ہوا ہوگا آخیر عمر میں اس بیماری نے بہت غلبہ پالیا۔ وفات سے تین دن پہلے آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ دعا کیجیے کہ خاتمہ بالخیر ہو۔ جمعہ کے دن مسجد میں گئے۔ وعظ کیا اور ادائے نماز سے فراغت پائی تو لوگوں سے یہ کہہ کر کہ مجھے امید نہیں کل اس وقت تک دنیا میں رہوں پھر آپ خلوت میں تشریف لے گئے۔ چنانچہ آپ کی اطلاع کے مطابق دوسرے دن دوپہر میں تریسٹھ سال کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ تاریخ وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی رائے

جناب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب "قول جمیل" میں نقشبندی طریقت کا شجرہ اس طرح بیان کیا ہے۔ شیخ احمد سرہندی نے خواجہ باقی باللہ سے فیض باطنی حاصل کیا جناب خواجہ محمد امکنگی سے۔ جناب امکنگی نے مولانا محمد درویش اور مولانا محمد زاہد سے۔ جناب زاہد، درویش نے خواجہ عبید اللہ احرار سے۔ احرار نے مولانا یعقوب چرخی اور خواجہ علاؤ الدین غجدوانی سے۔ غجدوانی چرخی نے خواجہ علاؤ الدین عطار اور خواجہ محمد پارسا سے۔ پارسا و عطار نے خواجہ بہاؤ الدین بانی سلسلہ نقشبندیہ سے۔ خواجہ نقشبند نے بہت سے بزرگوں کی صحبت پائی جن میں سب سے زیادہ مشہور خواجہ محمد سماسی اور ان کے خلیفہ امیر سید کلال ہیں۔ خواجہ سماسی نے خواجہ علی رامیتنی سے۔ انھوں نے خواجہ محمود ابوالخیر فغنوی سے۔ فغنوی نے عارف
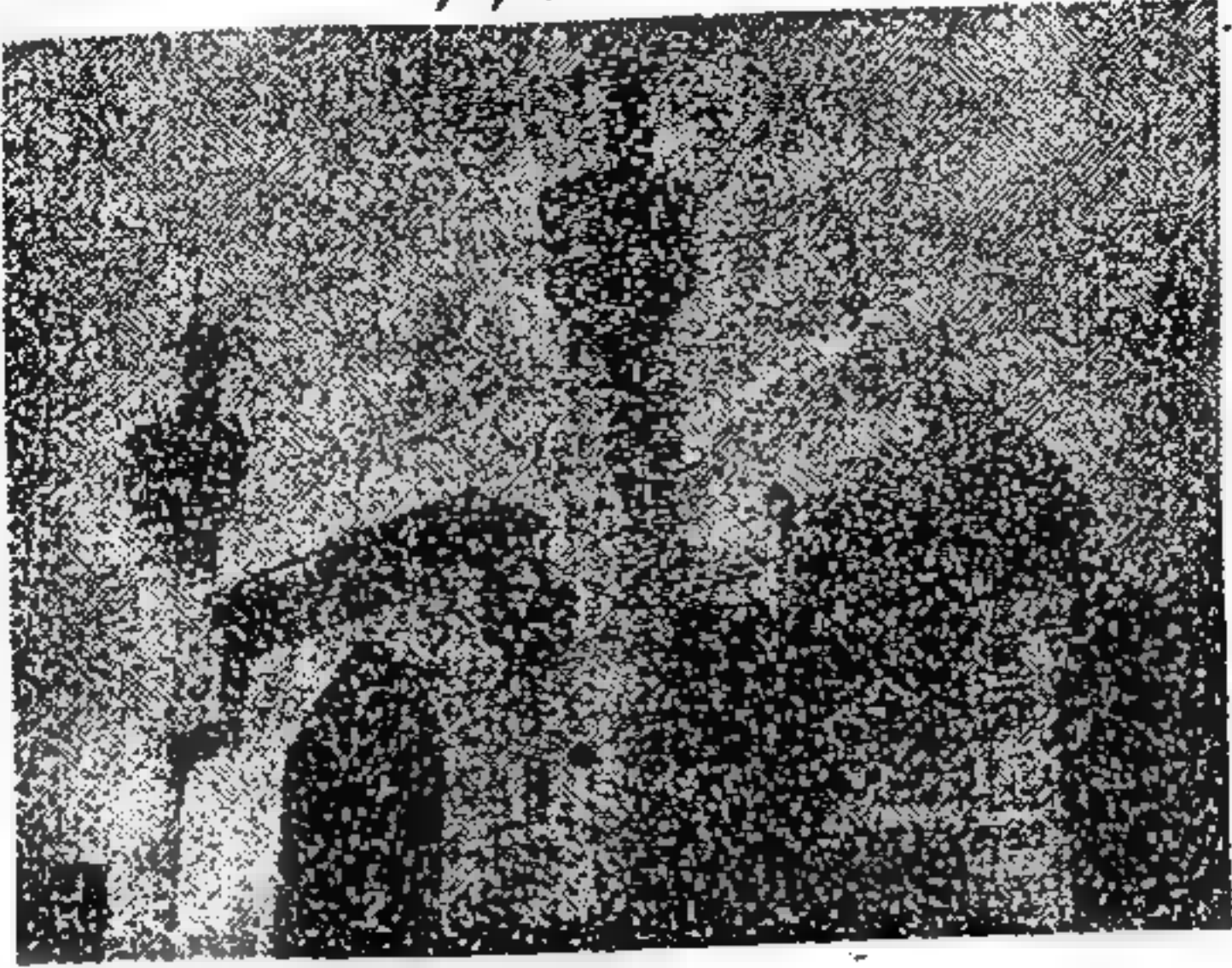
روضۂ مبارک حضرت شیرِ خدا علی مرتضیٰ رضؓ در نجف اشرف

کریوی سے کریوی نے خواجہ عبدالخالق عجدوانی سے۔ عجدوانی نے خواجہ یوسف ہمدانی سے ہمدانی نے جناب علی نارمدی سے نارمدی کے بہت سے مشائخ تھے۔ جن میں سے امام ابوالقاسم قشیری اور خواجہ ابوالقاسم گرمانی خاص کر مشہور ہیں۔ گرمانی و قشیری نے جناب ابوبکر شبلی سے، شبلی نے سید الطائفہ جناب جنید بغدادی سے، بغدادی نے اپنے ماموں شیخ سری سقطی سے۔ سقطی نے معروف کرخی سے۔ کرخی نے بہت سے مشائخ کے علاوہ امام علی بن موسیٰ رضا سے۔ موسیٰ رضا نے اپنے والد امام موسیٰ کاظم سے۔ جناب کاظم نے اپنے والد امام جعفر صادق سے۔ جناب صادق نے اپنے والد امام باقر سے جناب باقر نے اپنے والد امام زین العابدین سے، امام جناب زین العابدین نے اپنے والد جناب امام حسین رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے جناب علی بن ابی طالب سے۔ علی ابن ابی طالب نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیوضاتِ باطنی حاصل کیے۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ جناب معروف کرخی کے دوسرے مشہور شیخ۔ شیخ داؤد طائی ہیں جو فضیل۔ حبیب عجمی اور ذوالنون مصری کے فیض یافتہ تھے اور ان تینوں بزرگوں نے تابعین اور تبع تابعین سے بہت سے شیوخ کی صحبت کے علاوہ سب سے بڑھ کر جناب خواجہ حسن بصری کی صحبت و برکت فیض حاصل کیا۔ جناب خواجہ کو جناب علی ابن ابی طالب کے شاگرد و مرید ہونے کی سعادت میسّر آئی۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں امام جعفر صادق کو اپنے نانا جناب قاسم محمد بن ابوبکر صدیق رضؓ

سے بھی انتساب حاصل ہے۔ جناب قاسم نے سلمان فارسی سے فیض پایا۔ جناب فارسی نے ابوبکر صدیقؓ سے اور ابوبکر صدیقؓ نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

خواجہ باقی باللہؒ

مقامات سلوک طے کرنے اور فیوض باطنی سے بہرہ یاب ہونے کے باب میں جناب مجدد الف ثانیؒ کے پیر و مرشد جناب باقی باللہ کا اسم گرامی سیرت مجددیہ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب مجدد کے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کے سوانح کسی قدر اختصار کے ساتھ تبرکاً پیش کیے جائیں۔

خواجہ بتاریخ ۱۴ جولائی ۱۵۶۲ء کابل میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام نور رضی الدین تھا۔ لیکن شہرت دوام باقی باللہ کے نام سے پائی۔ آپ کے والد محترم جناب قاضی عبدالسلام ایک جیّد عالم تھے۔

جناب خواجہ نے ابتدائی تعلیم غالباً اپنے والد گرامی قدر ہی سے حاصل کی اس کے بعد علوم عقلی اور نقلی دیگر اساتذہ سے حاصل کیے۔ آپ کے اساتذہ میں جناب ملّا حلوائی جو عام طور پر ایک شاعر نغزگو کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے اور نہایت متبحر عالم تھے، سر فہرست ہیں۔

ملّا حلوائی نے اکبر کے چھوٹے بیٹے مرزا حکیم والی کابل کی پُر زور فرمائش پر درس و تدریس کا آغاز کیا تھا جن دنوں آپ بوجوہ چند کابل چھوڑ کر ماوراء النہر چلے گئے۔ جناب خواجہ بھی اپنے محترم استاد کے ساتھ تھے۔

ماوراء النہر اور افغانستان میں جتنے صوفیائے کرام و بزرگان دین تھے خواجہ ان سب کی خدمت میں یکے بعد دیگرے حاضر ہوئے۔ لیکن دل کا سکون اور طمانیت قلب جس کی مدتوں سے خواجہ کو تلاش تھی یہاں کہیں کسی سے بھی میسر نہ آسکا۔

پھر اسی تجسس میں آپ ہندوستان تشریف لائے۔ اور یہاں بہت سے بزرگان دین سے استفادہ کیا۔ اجمال اس بیان کا یہ ہے کہ کشمیر میں بابا بھائی کشمیری سے

اور لاہور میں شیخ زید بخاری سے ملنے کا موقع ملا اور ان کے علمی فضائل اور باطنی کمالات سے مستفید ہوئے۔ پھر جب کچھ مدت لاہور میں قیام کرنے کے بعد آپ یہاں سے چلے تو دہلی پہنچے اور وہاں پہنچ کر چشتیوں کے سلسلے کے مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں اقامت اختیار کی اور ان کے بیٹے شیخ قطب العالم کی خدمت میں رہ کر مقامات سلوک طے کیے۔

ایک مدت گزرنے کے بعد جب شیخ قطب العالم نے انھیں بخارا کا سفر اختیار کرنے کی تلقین فرمائی تو آپ اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں بخارا کو چل پڑے اور وہاں پہنچ کر مشائخ و اولیائے کرام کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ بالخصوص نقشبندی کے سلسلے کے ایک نہایت معتقد بزرگ خواجہ محمد درویش کے فرزندارجمند جناب خواجہ مکنگی کی خدمت میں رہ کر دینی و دنیوی سعادت پائی۔

خواجہ مکنگی نے آپ کو سلسلۂ نقشبندیہ کی تعلیم دی اور اس کے بعد حکم دیا کہ ہندوستان واپس جائیں اور وہاں بندگانِ خدا کے درمیان رہ کر انھیں حق کی طرف بلائیں اور اسلام کی تعلیم دیں کہ یہ تمھارا فرض منصبی ہے۔ چنانچہ خواجہ مرشد کی تعمیل حکم میں عازم ہندوستان ہوئے۔ آپ ہندوستان جاتے ہوئے پہلے پشاور پہنچے اور پھر لاہور آئے یہاں کم و بیش آپ ایک سال تک رہے۔ اس کے بعد آپ دہلی چلے گئے اور وہاں فیروز شاہ تغلق کے قلعے میں مقیم ہو گئے۔

خدا کی مخلوق سے محبت کرنا اولیاء اللہ کا امتیازی نشان ہے اور یہی وہ طاقت ہے کہ جس سے اولیائے کرام دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ سچ پوچھو تو اسلام کی توحید کا منشار بھی یہی ہے اور اس کا مظاہرہ اسلام کی تعلیمات کے ہر شعبے میں ہے یہاں تک کہ اسے آپ نماز باجماعت میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ نماز باجماعت میں جہاں ایک طرف تنظیم و عسکریت نظر آتی ہے وہاں دوسری طرف یکسانیت و محبت بھی کار فرما ہے۔

کہتے ہیں خواجہ کے قیام لاہور کے دوران ایک مرتبہ یہاں سخت قحط پڑا لوگ فاقوں مرنے لگے خواجہ اپنے مقدور بھر جو مدا دا کر سکتے تھے وہ آپ نے کیا اور اس طرح

فاقہ زدگان کے غم میں شریک ہوئے کہ آپ نے اپنی خوراک بہ نسبت پہلے کے اور بھی مختصر کردی۔ اکثر روزے رکھتے اور شام کو گھر میں جو کچھ پکتا اس کا بیشتر حصہ غریبوں میں بھجوا دیتے تھے۔

جناب خواجہ دہلی میں کل تین چار برس زندہ رہے مگر اس قلیل مدت میں آپ نے سلسلہ نقشبندیہ کی بہ تمام و کمال ہندوستان میں بنیاد رکھی اور اسے اتنا مضبوط کیا کہ پھر اس کی بنیادیں کسی کے ہلائے کبھی ہل نہ سکیں اور یہ کیا کم ہے کہ جناب خواجہ کا مجدد الف ثانیؒ ایسا صاحب قلم اور عالم باعمل مرید ہے۔ جس نے اکبر جیسے بادشاہ سے ٹکر لی یہاں تک کہ اس کا دینِ الٰہی جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گیا۔

آپ نے تاریخ اولیاء میں دیکھا ہوگا کہ اکثر اولیائے کرامؒ امراء و روساء سے دور رہے اور ان کے قرب کو اختیار نہیں کیا۔ لیکن خواجہ باقی باللہ کے ہاں یہ روایت اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ کے یہاں اگر ایک طرف علما میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ تاج الدین سنبھلی، خواجہ نور محمد اور مجدد الف ثانی ایسے مریدین ہیں تو دوسری طرف امرا میں خانِ اعظم مرزا عبدالرحیم خانخاناں سپہ سالارِ دکن جو اکبر کے دودھ شریک بھائی بھی تھے۔ بخشی الملک شیخ فرید، قلیچ خاں حاکم پنجاب جو اکبر کے بیٹے دانیال کا خسر بھی تھا مرزا حسام الدین جو شیخ مبارک کا داماد یعنی اکبر کے دینِ الٰہی کے دو بڑے سرگرم کارکن ابوالفضل اور فیضی کا بہنوئی تھا اور نواب مرتضیٰ خاں ایسا مقتدر امیر جس نے جہانگیر کی جانشینی کے تمام امور طے کیے اور جہانگیر سے شریعتِ اسلامی پر چلنے کا حلف لیا۔ غرض بڑے بڑے ارکین حکومت آپ کے معتقدین تھے اور وہ آپ کی اطاعت کے حلقے کو اپنے لیے دین و دنیا کی سعادت جانتے تھے۔

امراء و روساء سے میل جول بڑھانے اور تعلقات قائم کرنے سے آپ کا یہ مقصد نہیں تھا کہ آپ ان سے کام نکالیں اور اپنی خواہشات کو پورا کریں نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ بر تعلق جناب خواجہ عبیداللہ احرار کے جن سے خواجہ باقی باللہ کو بالخصوص دلی تعلق تھا۔ اس قول کی تعمیل میں تھا کہ معززین سے میل ملاپ رکھو تاکہ ان کے تعلق سے

تم بندگان خدا کی شکایات کو دُور کر سکو۔ معلوم ہوا کہ امرا سے تعلق رکھنا یا نہ رکھنا اولیائے کرام کے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ ان پر اپنا اثر و نفوذ قائم کر کے ان سے دوسروں کے کام نکلوانا مقصود ہے۔ بصورتِ دیگر اگر اس تعلق سے ذاتی اغراض وابستہ ہوتیں تو جناب خواجہ ایک لاکھ کی وہ رقم کبھی واپس نہ کرتے جو آپ کو خانخاناں مرزا عبدالرحیم نے حج کے سفر کے لیے پیش کی تھی اور بجمال وادب و مودّت یہ عرض کیا تھا کہ آپ اس رقم کو قبول کر کے فریضہ حج ادا کر لیجیے۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر کہ اس قسم کے حج سے کچھ فائدہ نہیں جو مانگے تانگے کی رقم سے ادا کیا جائے آپ نے وہ ایک لاکھ روپیہ واپس کر دیا۔

درحقیقت اراکین حکومت سے تعلقات بڑھانے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اکبر کے ملحدانہ خیالات امرا کی تائید پا کر پھیل نہ جائیں اس لیے اس کا سدّباب کرنے کے لیے یہ لازم ہوا کہ اراکین حکومت سے اختلاط بڑھا کر ان کے ذہن کو دین اسلام کے باب میں راسخ کیا جائے افسوس کہ جن دنوں خواجہ دوسری مرتبہ دہلی تشریف لائے۔ ان دنوں اکبر کے زمانے کے تمام معتمد و ممتاز مؤرخ مثلاً میر نظام الدین مصنّف طبقات اکبری اور ملاّ بدایونی ایسے جلیل القدر حضرات وفات پا چکے تھے اس لیے آپ کے حالات بالتفصیل نہیں ملتے تاہم بر سبیل تذکرہ اکثر کتابوں میں آپ کی سیرت کے بہت سے واقعات مل جاتے ہیں۔

تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ مرزا حسام الدین دکّن کی مہم پر مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے ہمراہ تھے۔ جناب خواجہ سے انھیں محبّت نہیں عشق تھا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے یہ جذبہ ان کی طبیعت پر کچھ ایسا غالب آیا کہ امارت کو لات مار کر فقیر بن گئے اور پھر تمام عمر خواجہ ہی کی خدمت کے ہو رہے۔ حتیٰ کہ جب خواجہ نے سفر آخرت اختیار کیا تو اس وقت ان کے سوا کوئی اور خواجہ کے پاس نہیں تھا۔ جناب خواجہ نے بعمر چالیس سال ۳۰ نومبر ۱۶۰۳ء میں انتقال کیا۔ واضح رہے کہ جناب خواجہ باقی باللہ اور آپ کے مرید یگانہ روزگار جناب مجدّد الف ثانی دونوں قریب قریب ہم عمر ہی تھے۔

خواجہ کے انتقال کے بعد آپ کے دونوں بیٹے خواجہ عبید اللہ المعروف بہ خواجہ کلاں

اور خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ خورد تربیت کے لیے جناب مجدّد کے پاس چلے گئے کہ خواجہ نے اپنی زندگی ہی میں انھیں جناب مجدّد سے بسم اللہ کروائی تھی اور پرورش کے لیے مرزا حسام الدین کے دامن شفقت میں آ گئے واضح رہے کہ خواجہ خورد ہی وہ بزرگ ہیں جن سے گیارہویں صدی ہجری کے مشہور عالم اور فلسفی ولی اللہ محدّث دہلوی کے والد محترم شاہ عبدالرحیم نے زانوئے تلمّذ تہ کیا۔

مرزا حسام الدین نے ۱۶۳۲ء میں انتقال کیا ان کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ جب تک حیات رہیں اپنے شوہر نامدار کی وصیت یا اشارے کے مطابق بارہ ہزار روپے سالانہ جناب خواجہ کی خانقاہ کے خرچ کے لیے بھیجتی رہیں۔

آپ نے خواجہ کے اثر و نفوذ اور ان کے اقتدار کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے آپ کی سیرت کا سب سے زیادہ جاذب نظر پہلو آپ کی طبیعت کی مسکینی و فروتنی تھا۔ جانے کتنی ہی مخلوق خدا آپ کے پاس مرید ہونے کو آتی۔ مگر آپ سب سے یہ کہہ کر معذرت کر لیتے کہ بھائی مجھ میں اتنی صلاحیت کہاں جو تمھارا ہاتھ پکڑ سکوں! کسی مرد کامل کی طرف دامن بڑھاؤ اور اگر ایسا کوئی بزرگ مل جائے تو مجھے بھی مطلع کرنا مگر جب کوئی شخص گھر سے یہ تہیّہ ہی کر کے نکلے اور مرید ہونے پر بے حد اصرار کرے تو آپ مجبور ہو جاتے اور اسے مرید کر لیتے۔

ہر چند مریدین پر کامل توجہ دیتے اور ان کے تزکیۂ نفس کی پوری کوشش کرتے لیکن اپنی طبیعت کے انکسار اور عجز کو کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اکثر کہا کرتے اے اللہ تو مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور اسی حال میں موت دے اور کل قیامت کے دن جب تو اٹھائے تو مسکینوں ہی کے گروہ سے مجھے اٹھانا۔

جناب مجدّد الف ثانی سے جب آپ ملتے تو آپ کے عجز و انکسار سے یوں معلوم ہوتا کہ آپ مرید ہیں اور مجدّد الف ثانی آپ کے مرشد ہیں اور اکثر مجدّد صاحب کے بارے میں کچھ اس انداز سے اظہار خیال کرتے کہ شبہہ واقعی حقیقت نظر آنے لگتا۔ چنانچہ آپ کی نسبت ایک دوست کو لکھتے ہیں۔ سرہند میں شیخ احمد نام ایک بڑے علم والا اور قوی

عمل والا ہے وہ چند روز فقیر کی مجلس میں رہا۔ فقیر نے اس کے روزگار اوقات سے بہت عجیب عجیب باتیں دیکھیں۔ امید ہے کہ وہ ایک ایسا چراغ ہوگا جس سے تمام جہان منور ہو جائے گا۔ اس کے احوال کامل دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا ہی ہوگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ شیخ مذکور کے جتنے عزیز و اقارب اور بھائی ہیں سب کے سب نیک اور عالم آدمی ہیں اس دُعاگو نے بعض سے ملاقات کی ہے تمام بیش قیمت جواہر ہیں اور بڑی عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ اس شیخ کے فرزندانِ ارجمند جو اپنے جگر و دلبند ہیں اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں۔ غرض وہ تمام لوگ شجرہ طیبہ کی طرح ہیں جس سے پاک شاخیں ہی نکلی ہیں۔ لیکن کثرت عیال اور فقر و تنگ دستی کے سبب اور کوئی وجہ معاش نہ ہونے سے ان تمام کے اوقات مشکل سے کٹ رہے ہیں۔ اگر ہر سال زکوٰۃ کے طور پر ان لوگوں کے لیے کچھ مقرر ہو جائے اور تقسیم کرنے والا ان کے درمیان مناسب طور پر تقسیم کر دیا کرے تو بہت ہی اچھا ہے اور بہت ہی نیکی اور اجر کا باعث ہے۔ تھوڑا بہت جتنا بھی مقرر ہو جائے خیرات اور نیکیوں کا رکن عظیم ہوگا۔ فقراء اللہ تعالیٰ کے دروازے پر ہوتے ہیں اور بہت ہی عجیب دل رکھتے ہیں۔

جناب خواجہ کے اس خط سے جہاں ان کی بے نفسی و بے غرضی اور بندگان خدا کے لیے درد اور تڑپ دکھائی دیتی ہے وہاں ان کی وہ جوہر شناسی و قدردانی بھی معلوم ہوتی ہے جو حضرت مجدد صاحب کے بارے میں ان کے قلم معجز رقم سے ادا ہوئی ہے ہر چند زبان عجز سے آپ جو کچھ جناب مجدد کی شان میں فرماتے ہیں وہ لفظ بلفظ عین حقیقت ہے لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ آپ منفی طرز کا ذہن رکھتے تھے یا علمی فضائل اور باطنی کمالات میں کسی سے کم تھے۔ حق تو یہ ہے کہ تصوف کی تاریخ میں آپ کا مقام بہت اونچا ہے اور آپ منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ بھلا وہ بزرگ جس کے فیضانِ صحبت سے مجدد الف ثانی ایسا یگانۂ روزگار تربیت پائے کیا مقام و منصب میں کسی سے کم ہو سکتا ہے اور ہندوستان میں نہایت قلیل مدت میں نقشبندی سلسلے کی مضبوط و مستحکم بنیادیں رکھنا

جناب مجددؒ مکتوبات کے آئینہ میں

ردِّ بدعت۔ مخالفت شیعیت اور احیائے اسلام

یہ تین موضوع جناب مجدد کی تمام تر مساعی کا ماحصل ہیں آپ کے مکتوبات کے مضامین انہی تین امور پر مشتمل ہیں۔ وہ لوگ جو گوشۂ تنہائی میں تسبیح کے لیے بیٹھتے تھے جن کو دنیا کے کاموں سے مطلق کوئی سروکار نہ تھا جن کو صرف گوشۂ عافیت ہی میں بھلائی نظر آتی تھی جناب مجدد نے انہیں دلیر کیا۔ ان کی ہمت بندھائی اور ان سے کہا کہ یہ وقت نہیں ہے کسی کونے یا گوشے میں بیٹھ رہنے کا۔ یاد خدا کرنا ہے تو میدان عمل میں آؤ تسبیح کے دانے بکھرے ہوئے ہیں انہیں قوّتِ عمل سے پروتے کی کوشش کرو اٹھو اور خدا کی راہ میں جہاد کرو کہ اس وقت یہ جہاد ہزاروں عبادتوں کی ایک عبادت ہے کفر کی طاقت بڑھتی چلی جا رہی ہے اگر وقت پر اس کی مدافعت نہ کی گئی تو یاد رکھو تم دنیا سے مٹ جاؤ گے اور کہیں تمہارا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔

جناب مجدد کے حسّاس دل پر خلاف اسلام واقعات کا بڑا اثر تھا اس لیے وہ نہ صرف بادشاہ کے مخالف تھے بلکہ مسلم دشمنوں سے بھی سخت نفرت کرتے تھے اور جذبہ انتقام ہر وقت ان کو بے چین کیے رکھتا تھا۔

اگرچہ اکبر کا دور ختم ہو چکا تھا۔ جملہ معترضہ کے طور پر اکبر کے بارے میں یہ بات مکرّر سمجھ کہ وہ کفر سے تائب ہو کر مرا کہا جاتا ہے کہ اس نے مرنے وقت کلمہ شہادت دہرایا۔ سورہ یٰسین پڑھوا کر سنی غرض اکبر کے بعد شہنشاہ جہانگیر کا دورِ حکومت شروع ہوا۔ اور جہانگیر بھی کون ؟ وہ بیٹا جو اکبر کے دین الٰہی کو پھیلانے اور اس کے اس برطرف ہے اور یہ آپ کی روحانی عظمت اور موجب خیر و برکت شخصیت ہونے کا بھی کھلا ثبوت ہے

ممد و مددگار بننے والے ابوالفضل ایسے لوگوں کا سخت مخالف بلکہ جانی دشمن تھا اور وہ جہانگیر جیسے خواجہ باقی باللہ کے مرید رکن السلطنت نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید ایسے سرداروں نے

مزار
سراپا اقدس
حضرت
مجدّد
الف ثانیؒ
کا
ایک
دلکش منظر
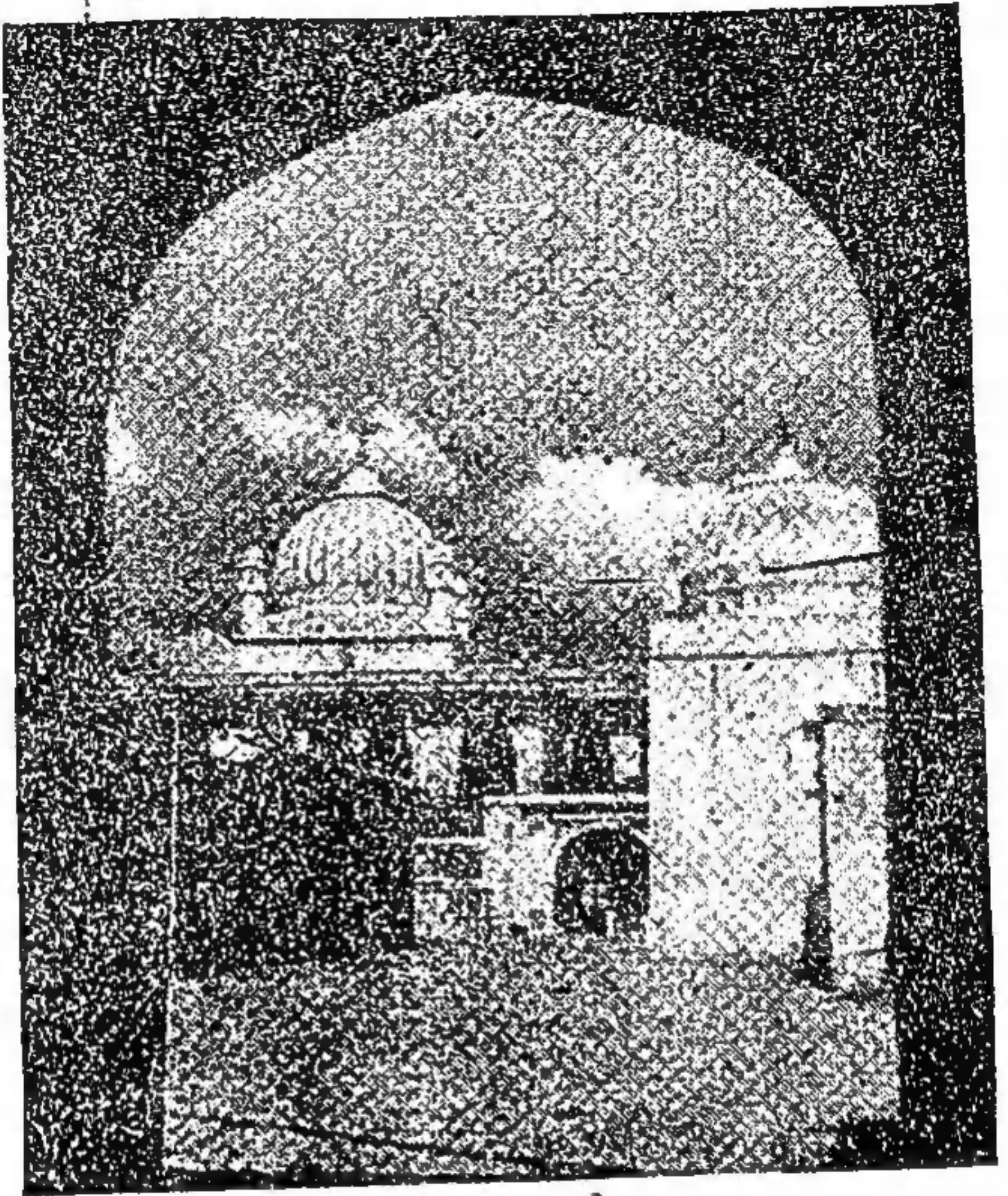
صرف اسی شرط پر اپنی ذات کا اعتماد بہم پہنچایا اور اس کی تخت نشینی کا اہتمام کیا تھا کہ وہ اسلام کی شریعت کے خلاف نہ چلے گا ان تمام باتوں کے باوجود اسلام دشمنوں کی ناشائستہ اور دلآزار حرکتیں دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھیں. جناب مجدّد کے حساس دل پر ان اخلاق سوز و ناشائستہ حرکات کا گہرا اثر تھا وہ ان باتوں کے سبب نہ صرف بادشاہ کے خلاف تھے بلکہ ان کو اسلام دشمنوں سے بھی سخت نفرت تھی۔

ایک خط میں انہی کے نام یوں لکھتے ہیں پس اسلام کی عزت. کفر اور کافروں کی ذلت میں ہے. جس نے کافروں کو عزیز رکھا پس اس نے اسلام کو خوار کیا.

کفار کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی مراد نہیں. بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے دشمنوں کی طرح ان کو دور کرنا چاہیئے اور اگر دنیاوی غرض ان سے کوئی ہو اور بغیر ان کے حاصل نہ ہوتی ہو تو پھر بے اعتباری کے طریق کو مدنظر رکھ کر ضرورت کے مطابق ان سے میل جول رکھنا چاہیئے اور کمال اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی درگزر کریں اور ان کی طرف نہ جائیں۔

جناب مجدّد مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں بظاہر ایک متشدد و متعصب شخصیت نظر آتے ہیں. لیکن حقیقت میں وہ ایسے نہیں تھے. ثبوت اس کا ایک خط ہے جو مرزا جعفر بیگ کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔" میرے مخدوم جب کفار قریش نے اپنی کمال بدنصیبی سے اہل اسلام کی ہجو اور برائی میں مبالغہ کیا تو جناب محمد رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے شاعروں کو حکم دیا کہ وہ کفار نگوسار کی ہجو کریں۔" اس خط کے بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جناب مجدّد الف ثانیؒ کا یہ نقطہ نظر مسلم دشمنوں کے خلاف ان کی جارحانہ کارروائیوں کے باعث قائم ہوا